نومبر 2021ء

ماہنامہ انٹرنیشنل لاہور لندن

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" اور "اُردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی ومذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

صفحہ نمبر 5

www.YouTube.com/lahoreinternational

Your favourite Monthly Magazine

Lahore International is relaunching its YouTube Channel

Subscribe now for great content!!

Where we go deep into the streets of Pakistan to bring you exclusive enjoyable content.

Head over to YouTube and check it out

ZINGMAAR
EASY TO FOLLOW
UNIQUE RECIPES FROM
AROUND THE WORLD
FOLLOW @ZINGMAAR

اس شمارہ میں

4 درس قرآن کریم
4 ایک رات میں مسجد تعمیر کا دلچسپ واقعہ
5 اداریہ
6 واٹس ایپ کے وہ نئے فیچرز جو اس ایپ کو بدل دیں گے
7 سر ظفر اللہ خان
10 پاکستانی طلبہ سائنس سے بیزار کیوں ہیں؟
12 نقشہ سارے مٹا ڈالے تھے گولی نے!
14 ایک فالج زدہ نومسلم کا واقعہ
15 غامدی صاحب سے معذرت کے ساتھ
16 پاکستان میں دوسری سہ ماہی میں...ٹک ٹاک
17 انصاف کس قدر ضروری ہے
18 توشہ خانے کے قومی راز
19 مذہبی شدت پسندی کی ایک مثال
20 چولبے چولبے سنگرام چولبے
21 کیہہ جاناں میں کون بلھیا!
22 یہ بھی ایک لائف اسٹائل ہے
24 مذہب کی آڑ میں سیاسی ناکامیاں چھپانے کی کوشش
26 ہمارے شرفاء
27 مہٹہ پیلس، تاریخ کے جھروکوں میں!
28 کراچی کے نیپئر وڈ کے قحبہ خانے اور کوٹھے کیسے اُجڑے؟
30 یہ قبرستان سیدوں کا ہے
32 احکام اسلام کی افادیت
33 ارتقاء اور ڈارون
35 کوہ ندا پر آوارہ بشارتیں
36 کابل، طالبان، امریکا اور گیم آف تھرونز
37 مولوی محمد باقر: 1857ء کا پہلا شہید صحافی
38 موپساں کا "نیکلس" اور سُمرسٹ مائم کا "لاکٹ"
39 ہندوستان میں مشہور یادگاری آپ ضرور دیکھیں
40 شمع شوق
41 وہ کام جو اقبال ادھورے چھوڑ گئے
45 مسلم تاریخ کے کچھ دلچسپ گوشے
47 علامہ شبلی نعمانی
51 دی گرینڈ ڈاٹر پروجیکٹ
52 وسط ایشیاء کے سفرنامہ سے ایک ورق
53 وائرس کے دور میں وائرس سے مدد
55 ن م راشد اور ان کی شعری تصنیفات

ADVERTISEMENT TARIFF

(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ

ھُوَ النّاصر

بعد از خُدا بعشقِ محمدؐ مخمرم   گر کُفر ایں بود بخُدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل لاہور لندن

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 6 شمارہ نمبر: 11 ربیع الاوّل/ربیع الثانی 1443 نومبر 2021

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی

ایڈیٹر
منزہ خان

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
ظہیر الدین عباسی (جرمنی)
محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
بدر الدین کلہوڑو (بیورو چیف سندھ پاکستان)
محمد عرفان (بیورو چیف سینٹرل پنجاب)
انس احمد (بیورو چیف لاہور)

ابن الامین (برطانیہ)
بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
عجب خان (بیورو چیف بلوچستان)
حق نواز (بیورو چیف وسطی پنجاب)
چوہدری مقبول احمد (بھارت)

قیمت فی شمارہ: 3 پاؤنڈ

website : lahoreinternational.com

اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com
m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ **لاہور** میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

درس قرآن کریم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ ۶۰ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ ۶۱ (سورۃ النساء آیت ۶۰، ۶۱)

ترجمہ:

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے حکام کی بھی۔ اور اگر تم کسی معاملہ میں (اُولوالامر سے) اختلاف کرو تو ایسے معاملے اللہ اور رسول کی طرف لَوٹا دیا کرو اگر (فی الحقیقت) تم اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان لانے والے ہو۔ یہ بہت بہتر (طریق) ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔

کیا تُو نے ان لوگوں کے حال پر نظر کی ہے جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں جو تجھ پر اتارا گیا اور اس پر بھی جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔ وہ چاہتے ہیں کہ فیصلے شیطان سے کروائیں جبکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کا انکار کریں۔ اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ وہ اُنہیں دُور کی گمراہی میں بہکا دے۔

تفسیر:

اس آیت کریمہ میں اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ میں مِنْكُمْ کا ترجمہ کرتے ہوئے بعض علماء یہ استنباط کرتے ہیں کہ مسلمانوں ہی میں سے اپنا حاکم بناؤ اور غیر مسلم حاکم کی اطاعت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک لغو عقیدہ ہے جو عمومی نظر ڈالنے سے ہی غلط ثابت ہوتا ہے۔ سب مسلمان جو غیر مسلم حکومت میں بستے ہیں یا وہاں ہجرت کر جاتے ہیں وہ ان کی حکومت کے قوانین کے پابند ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جو مسلمان حاکم ہو اس سے کسی معاملہ میں تنازعہ کا کیا سوال ہے جس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹایا جائے۔ یہاں اللہ اور رسول سے واضح مراد قرآنی تعلیم ہے۔ پس کوئی بھی حاکم ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم، اگر قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلافِ عمل کرنے کا حکم دے تو ایسی صورت میں قرآن کی بات ماننا ہوگی نہ کہ حاکم کی۔ (اُردو ترجمہ قرآن صفحہ ۱۴۰)

حدیث:

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ میں نے عید الاضحیٰ کی نماز پڑھی حضور کے پاس ایک مینڈھا لایا گیا جسے آپ نے ذبح کیا۔ ذبح کرتے وقت آپ نے یہ الفاظ کہے: اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔ اے میرے خدا! یہ قربانی میری طرف سے اور میری امت کے ان لوگوں کی طرف سے جو قربانی نہیں کر سکتے قبول فرما۔ (ترمذی کتاب الاضحیٰ)

❁❁❁

ایک رات میں مسجد تعمیر کا دلچسپ واقعہ

لاہور کے شاہ عالم چوک میں ایک ایسی مسجد واقع ہے جسے ایک رات میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس مسجد کی اتنے قلیل وقت میں تعمیر کی وجہ اور واقعہ بھی انتہائی دلچسپ اور ایمان افروز ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انگریزوں کے دور میں اس مقام سے ایک مسافر سے گزر رہا اور اس نے یہاں نماز ادا کی جبکہ یہ علاقہ اس وقت ہندوؤں کی اکثریت کا حامل تھا۔ ہندوؤں کو یہ برداشت نہ ہوا اور انہوں نے ہنگامہ آرائی شروع کر دی۔ معاملہ عدالت تک جا پہنچا اور وہاں ہندوؤں کا مؤقف تھا کہ اس جگہ پر مندر تعمیر ہو گا جبکہ مسلمان یہاں مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کے وکیل نے انہیں تجویز دی کہ اگر وہ یہاں صبح فجر سے پہلے مسجد تعمیر کر لیتے ہیں تو کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو جائے گا۔ مسلمانوں کی جانب سے اس کیس کی پیروی قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کر رہے تھے۔ یہ سننا تھا کہ مسلمانوں نے گاماں پہلوان کی قیادت میں راتوں رات مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اور جس مسلمان کے پاس جو سامان تھا اس نے وہ مسجد کی تعمیر کے لیے وقف کر دیا۔ یہاں تک کہ خواتین رات بھر اپنے سروں پر پانی رکھ کر لاتی رہیں تاکہ مسجد کی تعمیر ممکن ہو سکے۔ دوسری جانب مسجد کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد عدالت نے بھی مسلمانوں کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ یہ مسجد ۱۹۱۷ میں تعمیر کی گئی اور اس کا نام "مسجد شب بھر" رکھا گیا۔ یہ مسجد ۳ مرلے کے رقبے پر تعمیر ہے۔ علامہ اقبال کو جب تیسرے روز اس مسجد کی تعمیر کا پتہ چلا تو آپ یہاں تشریف لائے اور بہت خوش ہوئے اور یہی وہ موقع تھا جب انہوں نے یہ مشہور شعر کہا:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے　　　من اپنا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا

❁❁❁

مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

اداریہ

انصاف کرو ورنہ یاد رکھنا!

ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں قرآن کا مؤمن

اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں

یہ دیس ہے سب کا اس کا نہیں کوئی

انصاف کرو ورنہ یاد رکھنا حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے قاتل صرف نو افراد تھے مگر غرق، تباہ پوری قوم ہوگئی تھی۔ کیونکہ باقیوں کا جرم خاموش رہنا تھا۔ سورۃ الاعراف آیت: 74 کی تفسیر ہے کہ ''ناقۃُ اللہ'' سے مراد حضرت صالح علیہ السلام کی وہ اونٹنی ہے جس پر سوار ہو کر وہ قوم کو رسالت کا پیغام پہنچایا کرتے تھے۔ جب بعض بدبخت سرداروں نے اس ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں اور ان کا ذریعہ پیغام رسانی ختم کر دیا تو اس کے نتیجہ میں عذاب کے مستحق ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ 9 سردار تھے جنہوں نے اس بات پر اکٹھ کیا تھا۔ اس سورت کی اگلی آیات میں ہے کہ انہوں نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی اور پس انہیں ایک سخت زلزلے نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل پڑے رہ گئے۔ قرآنِ کریم میں متعدد بار واضح ثبوت دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ اللہ تعالیٰ کی ہستی اس کا قانون اور اس کی طرف بھیجے گئے بندوں کی تعلیمات کو یکسر نظر انداز کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑھ کر دو ظالم شخص ہیں ایک مفتری علی اللہ، دوم جو نبی کی باتوں اور اس کا انکار کرے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور اولیاء اللہ اور مؤمنین صادقین کی مسلسل بے حرمتی کی جا رہی ہے۔ حالانکہ قرآن کی تعلیم ہے کہ کسی انسان کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھے علاوہ ازیں سورت السجدہ آیت 23 میں فرمایا کہ وَمَنْ اَظْلَمُ یعنی انبیاء اور ان کے نشانوں کے منکر اور ان سے اعراض کرنے والے سب سے بڑے ظالم ہیں اور خدا تعالیٰ ایسے قطع تعلق کرنے والوں کو ضرور سزا دے گا۔ دوسری آیت 22 میں فرمایا۔ دنیا میں اس لئے عذاب آتے ہیں تا لوگ ان بد اعمالیوں سے باز آئیں جن میں وہ گرفتار ہیں۔ حالیہ دنوں میں ہمیں دو ایسے واقعات دیکھنے کو ملے جن میں صراحتاً اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ ایک تو صوبہ خیبر پختونخواہ کے علاقہ کرک میں ہندوؤں کی عبادت گاہ کو جلا کر مسمار کر دیا گیا۔ دوسرا صوبہ بلوچستان کے علاقہ مچھ میں شیعہ ہزارہ برادری کے 11 افراد کو قتل کر دیا گیا اور یہ دونوں کام ہمارے مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں انجام پائے۔ ہندوؤں کے مندر کو نذرِ آتش کرنے پر چیف جسٹس آف پاکستان نے ازخود نوٹس لیا اور اس واقعہ کی رپورٹ طلب کر لی ہے۔ یاد رہے یہ امن معاہدے اور سپریم کورٹ کے حکم کی خلاف ورزی تھی جو شر پسندوں نے کی۔ دوسرا واقعہ بلوچستان کے علاقہ مچھ میں ہزارہ برادری کی ہلاکت کا تھا۔ اس کی ذمہ داری شدت پسند تنظیم دولتِ اسلامیہ (داعش) نے قبول کی ہے۔ اس سے قبل بھی ان علاقوں میں کان کنوں کو اغوا کر کے قتل کیا جا چکا ہے۔ مذہبی اقلیت کا اس نوعیت کا یہ پہلا واقعہ نہیں اس سے قبل شیعہ مخالف تنظیم لشکرِ جھنگوی اور جیش اسلام نے بھی کئی ہزار شیعہ برادری کے افراد قتل کئے ہیں۔ انسانی حقوق کی ایک تنظیم کے مطابق گزشتہ دو دہائیوں کے دوران بلوچستان میں شیعہ ہزارہ برادری کے 3 ہزار افراد قتل ہو چکے ہیں۔ دیکھا جائے تو تمام پاکستانی اقلیتیں اپنے آپ کو پاکستان میں غیر محفوظ تصور کر رہی ہیں جس کے باعث لاکھوں افراد بیرونِ ممالک ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

25 فی صد اقلیتوں کا یہ ملک ہے اور 75 فی صد اکثریتی برادری کے بنیاد پرستوں کے ذریعہ پائے جانے والے فرقہ وارانہ تشدد میں بے حساب افراد کا قتل اور اغوا ہوا، اور یہ توہینِ رسالت کے قانون کے غیر معمولی، اور غیر معیاری ثبوت کی بنیاد پر اور ناقص توہینِ رسالت کے قانون کے تحت افراد کو سزا دینے کے باعث بنتی ہے۔ اس کی سزا طویل مدتی جیل اور موت ہے۔ پاکستان میں توہینِ مذہب کے قوانین کے مطابق دینِ اسلام کی توہین کرنے والے کو سزا موت سنا سکتی ہے لیکن ناقدین کا کہنا ہے کہ ان قوانین کو اقلیتی برادری کو ہی نشانہ بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ چند اسلامی تنظیموں کا قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اس کا بخوبی علم ہے جو بنیاد پرست ہیں لیکن وہ بے بس اور تماشائی کی طرح رویہ اختیار کیے رہتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ پولیس کے علاوہ عدالتی نظام بھی بے بس نظر آتا ہے۔ ججز جن کا کام صرف انصاف کرنا ہے بلا خوف وخطر ایسے موقع پر وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور کان بھی۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کے اصول کی صراحتاً خلاف ورزی ہے۔ ایسی ریاست اور قوموں کے متعلق قرآنِ کریم میں ذکر

آیا ہے کہ ایک دن ان تمام کو دنیا میں اور آخرت میں جوابدہ ہونا پڑے گا۔

ان دونوں واقعات پر بیانات، تبصرے اور انصاف دینے کی باتیں حکمران جماعت، فوج اور عدالتوں کی طرف سے کئے جا رہے ہیں لیکن ماضی کی طرح انصاف ملنا مشکل ہے۔ پاکستان کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ پچھلی دو دہائیوں سے عیسائیوں اور احمدیوں کی عبادت گاہوں پر حملے اور ان کے افراد کو قتل کیا گیا۔ اور ان پر جھوٹے مقدمات قائم کئے گئے ہیں جن کو آج تک کوئی انصاف نہ ملا اور نہ ہی قاتل گرفتار ہوئے اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ عدالتیں بھی انصاف نہ کر سکیں۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم کی روشنی میں کہ جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے اور جو بیجو گے وہی نکلے گا۔ نیک اعمال کا نتیجہ نیک اور بد کا بد انجام ہے۔ یاد رکھیے خدا کے پاک لوگوں کو خدا سے نصرت آتی ہے۔ جب آتی ہے تو پھر عالم کو اِک عالم دکھاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے یہ قوم روز بروز اخلاقی قدروں، انسانیت کی خدمت سے عاری، اسلامی تعلیمات سے دور اور دہشت گردی اور تنگ نظری کا شکار بنتی جارہی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ قوم برائیوں کے دلدل میں پھنستی جارہی ہے جس سے باہر نکلنا مشکل ہے اور آج ایک عام شہری بھی محفوظ دکھائی نہیں دیتا۔ قرآنی تعلیم ہے کہ جب کوئی ان کو ہدایت کی طرف بلاتا ہے تو ان عقل کے بہروں کو اس کی پکار سنائی نہیں دیتی۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے مامور من اللہ، فرستادہ کی نافرمانی کر رہے ہوتے ہیں۔ سورہ یٰسین آیت 31 میں فرمایا: ترجمہ: وائے حسرت بندوں پر! ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا مگر وہ اس سے ٹھٹھا کرنے لگتے ہیں۔

جب ایک مضطر دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمالیتا ہے لیکن ہماری پوری قوم نے پچھلے سال مولانا طارق جمیل کی قیادت میں ملک میں پائی جانے والی تمام برائیوں سے توبہ اور آسمانی وباء سے دعانجات بھی کروا دی لیکن پھر بھی ہم ان برائیوں سے پاک نہیں ہو پائے۔ ایک سال سے زائد عرصہ ہو چلا کرونا وباء دنیا سے جانے کا نام نہیں لے رہی بلکہ اس میں اضافہ اور کئی اور قسم کی وبائیں پھوٹ رہی ہیں۔ یہ ایک انذار اور قوموں کے لئے تنبیہ، الارم ہے۔ خدا کی طرف سے اگر بنی نوع انسان نے آج اس کو نہ سمجھا تو پھر خدا کی تقدیر اپنا کام کرے گی۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہر ایک انسان کو خود اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے ورنہ کچھ باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا ایک دوسرے سے محبت، پیار کریں، مدد کریں، ہر فرقہ کا احترام کریں اور امن کے ساتھ رہیں یہ بنیادی عنصر ہے جس کے لئے خدا تعالیٰ نے انسانِ آدم کو زمین پر بھیجا ہے۔ ''محبت سب سے نفرت کسی سے نہیں'' اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم کی سورۃ یٰسین آیت 67 میں فرماتا ہے۔ قیامت کے دن انسان کی جواب طلبی ہو گی ہر انسان کے اعضاء بھی اپنے جرائم کا اقبال کریں گے۔

اِک نہ اِک دن پیش ہو گا تُو فنا کے سامنے
چل نہیں سکتی کسی کی کچھ قضا کے سامنے

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں انصاف کرنے، پیار محبت سے رہنے کی، ہماری کمزوریوں، برائیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

❁❁❁

واٹس ایپ کے وہ نئے فیچرز جو اس ایپ کو بدل دیں گے

واٹس ایپ دنیا کی مقبول ترین مسیجنگ اپلیکشن ہے جس کے صارفین کی تعداد ۲ ارب سے زائد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واٹس ایپ کی جانب سے مسلسل نت نئے فیچرز پر کام ہوتا رہتا ہے تاکہ اس کے صارفین کسی اور میسجنگ ایپ کا رخ نہ کریں۔ عام طور پر یہ نئے فیچرز پہلے بیٹا پروگرام میں آتے ہیں اور وہاں مختلف آزمائشی مراحل سے گزرنے کے بعد تمام صارفین تک پہنچتے ہیں۔ آنے والے ہفتوں یا مہینوں میں بھی واٹس ایپ کی جانب سے متعدد فیچرز متعارف کرائے جائیں گے، جن کے بارے میں ابھی علم نہیں۔ مگر کچھ فیچرز ایسے ہیں جو اس وقت بیٹا ورژنز میں موجود ہیں اور امید ہے کہ آنے والے ہفتوں یا مہینوں میں صارفین کو دستیاب ہوں گے۔

میسج ری ایکشنز: فیس بک میسنجر میں میسج ری ایکشنز کا فیچر تو کافی عرصے سے موجود ہے اور اب بہت جلد واٹس ایپ میں بھی اسے متعارف کرایا جائے گا۔ فیس بک میسنجر استعمال کرنے والے اس فیچر سے بخوبی واقف ہیں اور واٹس ایپ میں بھی کسی میسج پر صارف ایموجی سے اپنا ردعمل ظاہر کر سکیں گے۔ ری ایکشنز کے لیے کتنے ایموجیز واٹس ایپ میں دستیاب ہوں گے اس بارے میں ابھی کچھ کہنا ممکن نہیں۔

چیٹ ببلز کا نیا انداز: صارفین واٹس ایپ پر اپنا زیادہ وقت چیٹ ونڈوز میں گزارتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کمپنی اس تجربے کو بہتر بنانا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے میسج کے ارگرد جو سبز ببلز نظر آتے ہیں انہیں ری ڈیزائن کیا جارہا ہے تاکہ ان ببلز کو زیادہ پرکشش بنایا جاسکے۔

پہلے سے بہتر کانٹیکٹ کارڈ: واٹس ایپ کے اینڈرائیڈ ورژن میں کمپنی کی جانب سے پہلے سے بہتر ڈیزائن والے کانٹیکٹ کارڈ کا فیچر جلد متعارف کرایا جائے گا۔ اس وقت کانٹیکٹ کارڈ میں صرف فوٹو نظر آتی ہے مگر ری ڈیزائن کارڈ میں کالز، ٹیکسٹ اور ویڈیو کال کے آپشنز بھی موجود ہوں گے، گروپ کانٹیکٹ کارڈ میں ٹیکسٹ بھیجنے کا آپشن ہو گا۔

نئے فوٹو ایڈیٹنگ ٹولز: واٹس ایپ کی جانب سے ایک ایسے فوٹو ایڈیٹر پر کام کیا جارہا ہے جو اس وقت اسٹوریز میں دستیاب فوٹو ایڈیٹر سے ملتا جلتا ہے۔ اس فوٹو ایڈیٹر سے صارفین فوٹوز میں اسٹیکرز کا اضافہ کر سکیں گے اور ان کو کراپ بھی کر سکیں گے، اسی طرح فوٹوز میں ٹیکسٹ اور ایموجیز کو بھی شامل کیا جاسکے گا۔

اپ ڈیٹڈ وائس میسجز: واٹس ایپ کی جانب سے وائس میسجز فیچر کو بھی اپ ڈیٹ کیا جارہا ہے۔ اب صارفین وائس میسجز کو بھیجنے سے پہلے سن بھی سکیں گے جبکہ واٹس ایپ کی جانب سے پیغام ریکارڈ کراتے ہوئے ویوفارم کو بھی ڈسپلے کیا جائے گا۔ یہ فیچر بھی بیٹا ورژن میں موجود ہے جس کی آزمائش کچھ عرصے تک جاری رہے گی جس کے بعد اسے عام صارفین کے لیے متعارف کرایا جائے گا۔ ❁❁❁

شعبہ پاکستان

سر ظفراللہ خان

تحریر: عقیل عباس جعفری

جنرل اسمبلی کے صدر، عالمی عدالت انصاف کے سربراہ واحد پاکستانی جنھیں ان کے عقائد کی وجہ سے عہدے سے ہٹانے کا مطالبہ کیا گیا

اقوام متحدہ میں سیکریٹری جنرل کے عہدے کے بعد اہم ترین عہدہ جنرل اسمبلی کے صدر کا عہدہ ہے۔ پاکستان گذشتہ ۷۴ برس سے اقوام متحدہ کا رکن ہے مگر جنرل اسمبلی کا یہ عہدہ صدارت صرف ایک مرتبہ پاکستان کے حصے میں آیا ہے اور سر ظفراللہ خان نے ستمبر ۱۹۶۲ سے ستمبر ۱۹۶۳ تک اس عہدے پر خدمات سرانجام دی ہیں۔

سنہ ۱۹۶۱ میں جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی صدارت پر تیونس کے مونجے سلیم منتخب ہوئے تو اسی وقت سے یہ بات گردش میں تھی کہ آئندہ سال یہ منصب ایشیا کے کسی سفارتکار کو ملنا چاہیے۔ چوہدری ظفراللہ خان نے پروفیسر ولکاکس اور پروفیسر ایمبری کو دیے گئے انٹرویو میں جو 'سر ظفر اللہ خان کی یادداشتیں' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا بتایا کہ 'مجھے اس تجویز پر تحفظات تھے اور میرا موقف یہ تھا کہ افریقن صدر کے فوراً بعد کسی ایشیائی کا یہ منصب سنبھالنا مناسب نہیں۔ میرا خیال تھا کہ افریقی اور ایشیائی ممالک کی تعداد میں اضافہ ہونے سے یہ خدشہ بڑھ رہا ہے کہ یہ ممالک اقوام متحدہ کے اندر معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا شروع کر دیں گے۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر ہمیں (یعنی افروایشیائی ممالک کو) ہر تیسرے برس صدارت ملتی رہے تو بہت ہے۔'

انھوں نے مزید بتایا کہ 'میری تجویز تھی کہ اس سال اقوام متحدہ میں ارجنٹائن کے مندوب رامادو کو میدان میں اترنے دینا چاہیے اور اب کی بار صدارت لاطینی امریکا کو دے دینی چاہیے مگر اسی دوران ارجنٹائن میں سیاسی انقلاب آ گیا اور رامادو مستعفی ہو کر اپنے وطن واپس چلے گئے۔' 'اسی اثنا میں بعض ایشیائی ممالک نے اپنے امیدواروں کے نام کا ذکر کرنا شروع کیا اور اقوام متحدہ میں سیلون (موجودہ سری لنکا) کے مندوب پروفیسر ملالاسیکرا نے اپنے لیے لابنگ شروع کر دی۔ افروایشیائی گروپ کے چیئرمین اُردن کے مندوب رفاعی تھے۔ انھوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور پوچھا کہ کیا میں اس عہدے کے لیے اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں؟' 'میں نے کہا کہ اگرچہ ارجنٹائن کے رامادو اپنے وطن واپس جا چکے ہیں مگر میں اب بھی اس عہدے کے لیے لاطینی امریکا کے کسی ملک کے امیدوار کو زیادہ مناسب سمجھتا ہوں مگر رفاعی مصر رہے کہ ان کی اور ان کے احباب کی نظر میں اس عہدے کے لیے میں مناسب ترین آدمی ہوں۔'

سر ظفراللہ خان نے رفاعی کو ٹالنے کے لیے کہا کہ 'میں اس سلسلے میں اپنے ملک سے مشورہ کروں گا اگر مجھے میرے ملک نے اجازت دی تو پھر میں آپ کی اس تجویز پر غور کر سکوں گا۔ میں نے حکومت پاکستان سے مشورہ طلب کیا، جواب آیا کہ اگر حالات سازگار ہیں تو اپنے نام کا اعلان کر دیں، میں نے حکومت کے ارشاد کی تعمیل کی۔ اب میدان میں دو امیدوار تھے۔ ملالاسیکرا اور میں۔'

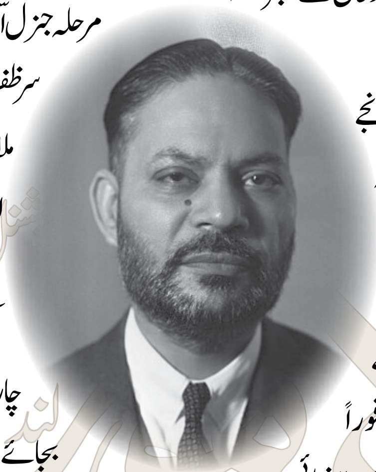

اٹھارہ ستمبر 1962ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا سترہواں سالانہ اجلاس شروع ہوا تو پہلا مرحلہ جنرل اسمبلی کی صدارت کا انتخاب تھا۔ اس عہدے کے لیے اقوام متحدہ میں سر ظفراللہ خان اور سیلون (موجودہ سری لنکا) کے مستقل مندوب پروفیسر ملالاسیکرا کے درمیان مقابلہ ہوا۔ ایک سو تین ممالک کے نمائندوں نے اس انتخاب ووٹ ڈالا جس میں سر ظفراللہ خان نے ۷۲ اور پروفیسر ملالاسیکرا نے ۲۷ ووٹ حاصل کیے، جبکہ چار ووٹ امیدوار کا نام لکھنے کے بجائے اس کے ملک کا نام لکھنے کی وجہ سے ضائع ہو گئے (یہ چاروں ووٹ بھی سر ظفراللہ خان کو دیے گئے تھے مگر ان کے نام کے بجائے پاکستان لکھا تھا)۔

یوں اس عہدے پر سر ظفراللہ خان منتخب قرار دے دیے گئے۔ سر ظفراللہ خان اس منصب پر فائز ہونے والے پہلے اور تادم تحریر واحد پاکستانی ہیں۔ سر ظفراللہ خان کے عہد صدارت میں جنرل اسمبلی کے سترہویں سالانہ اجلاس میں اقوام متحدہ کی رکنیت میں چھ اراکین کا اضافہ ہوا۔ ان اراکین میں سب سے اہم ملک الجزائر تھا۔ اس اجلاس کی ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ اس اجلاس سے پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خان نے بھی خطاب کیا۔

اقوام متحدہ سے سر ظفراللہ خان کی وابستگی

اقوام متحدہ میں پاکستان کا جو پہلا وفد بھیجا گیا اس کے سربراہ بھی سر ظفراللہ خان ہی تھے۔ وفد کے دیگر ارکان میں مرزا ابوالحسن اصفہانی، پیرزادہ عبدالستار، میر لائق علی اور بیگم سلمیٰ تصدق حسین شامل تھے۔ پاکستان ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ کو اقوام متحدہ کا رکن بنا تھا، اسی دن شمالی یمن بھی اقوام متحدہ میں شامل ہوا۔ پاکستان اس ادارے کی رکنیت حاصل کرنے والا دنیا کا 56 واں ملک تھا۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کو رکن بنانے کی تجویز اقوام متحدہ میں انگلستان کے مندوب مسٹر ہیکٹر میک نیل نے پیش کی تھی جس کی تائید میں انڈیا، مصر، امریکا، ایران، عراق، ترکی، لبنان اور برازیل کے نمائندوں نے تقاریر کیں۔

اس کے بعد رائے شماری ہوئی جس میں اجلاس میں موجود 54 ممالک میں سے 53

ممالک نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ افغانستان واحد ملک تھا جس نے پاکستان کی رکنیت کی مخالفت کی۔ رکنیت ملنے کے بعد سر ظفر اللہ خان نے جوابی تقریر کی اور کہا ’میں اپنی حکومت کی جانب سے اقوام متحدہ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ پاکستان ہر امکانی قوت کے ساتھ اس امر کی کوشش کرے گا کہ قوموں کے درمیان بہتر تعلقات پیدا ہوں، نیز دنیا میں پائیدار امن وامان قائم رکھنے کے لیے وہ اپنی انتہائی کوششیں صرف کرے گا۔‘

سر ظفر اللہ خان اپنی خود نوشت ’تحدیث نعمت‘ میں لکھتے ہیں کہ ’پاکستان جس اجلاس میں اقوام متحدہ کا رکن بنا اس میں جو مسئلہ زیر بحث تھا وہ فلسطین کا مسئلہ تھا اور اقوام متحدہ کے فلسطین کمیشن نے فلسطین کی تقسیم کی سفارش کی تھی۔ جب پاکستان کی طرف سے میں نے اس مسئلے پر تقریر کا آغاز کیا تو عرب نمائندگان کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میری تقریر کا رخ کس طرف ہو گا۔ پاکستان ایک دو دن قبل ہی اقوام متحدہ کا رکن منتخب ہوا تھا۔ عرب ممالک کے مندوبین ہمیں خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے اور ہماری طرف سے بالکل بے نیاز تھے۔‘

سر ظفر اللہ خان نے مزید لکھا کہ ’جب میں نے فلسطین کی تقسیم کے منصوبے کا تجزیہ شروع کیا تو اس کے ہر حصے کی ناانصافی کی وضاحت شروع کی تو عرب نمائندگان نے میری تقریر کو توجہ سے سُننا شروع کیا۔ تقریر کے اختتام پر ان کے چہرے خوشی اور طمانیت سے چمک رہے تھے، اس کے بعد اس معاملے میں عرب مؤقف کا دفاع زیادہ تر پاکستان کا فرض قرار دے دیا گیا۔‘ سر ظفر اللہ خان کی اس تقریر کی تعریف مخالف کیمپ کے نمائندوں نے بھی کی، جن میں نیوزی لینڈ کے سر کارل بیرنڈسن سرفہرست تھے، تاہم امریکی دباؤ کے باعث فلسطین کی تقسیم کی تجویز اکثریت رائے سے منظور کر لی گئی۔ اجلاس کے خاتمے کے بعد سر ظفر اللہ خان پاکستان واپس لوٹ آئے۔

قیام پاکستان سے قبل سر ظفر اللہ خان ریاست بھوپال کے نواب سر حمید اللہ خان کے مشیر تھے۔ انھوں نے واپس بھوپال جانا چاہا مگر وزیر اعظم لیاقت علی خان نے انھیں مطلع کیا کہ بانی پاکستان محمد علی جناح ان کی خدمات پاکستان کے لیے حاصل کرنا اور انھیں وزیر خارجہ کے منصب پر فائز کرنا چاہتے ہیں چنانچہ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ کو انھوں نے اس منصب کا حلف اٹھالیا۔ وہ ۳۰ جون ۱۹۵۴ تک اس عہدے پر فائز رہے۔

جنوری ۱۹۴۸ میں انڈیا نے مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں پیش کر دیا، جہاں ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ کو اس مسئلے پر بحث کا آغاز ہوا۔ اس اجلاس میں شرکت کے لیے حکومت پاکستان نے جو وفد نامزد کیا وہ حسب ذیل افراد پر مشتمل تھا: سر ظفر اللہ خان (نمائندہ)، ابوالحسن اصفہانی (متبادل نمائندہ)، مسٹر وسیم ایڈووکیٹ جنرل پاکستان (مشیر)، مسٹر افتخار حسین ڈپٹی سیکریٹری وزارت خارجہ اور کرنل مجید ملک (رکن)۔ سر ظفر اللہ خان اپنی خود نوشت ’تحدیث نعمت‘ میں رقم طراز ہیں کہ ’ہندوستانی وفد کے سربراہ سر گوپالا سوامی آئینگر تھے جو برسوں ریاست کشمیر کے وزیر اعظم رہ چکے تھے اور ان دنوں انڈیا کی مرکزی حکومت میں وزیر تھے، اُن کے معاون سر گرجا شنکر باجپائی اور مسٹر ایم ایل سیتلواڈ تھے۔ ان دنوں سلامتی کونسل کے اراکین ارجنٹائن، بیلجیئم، چین، کینیڈا، کولمبیا، فرانس، شام، روس، برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ امریکا اور یوگوسلاویہ تھے، ان میں سے چین، فرانس، روس برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکا تو مستقل اراکین تھے اور باقی چھ میعادی اراکین۔‘

ہندوستان کی طرف سے سر گوپالا سوامی آئینگر نے ۱۵ جنوری کو سہ پہر کے اجلاس میں تقریر کی: خلاصہ اس کا یہ تھا مہاراجہ کشمیر نے ریاست جموں وکشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ برضا ورغبت کیا ہے، اِس کے خلاف پاکستان کے اکسانے پر اور اس کی مدد کے ساتھ قبائلیوں نے ریاست پر حملہ کر کے بہت فساد اور خون خرابہ کیا، قبائلیوں کی روک تھام کے لیے ہندوستان کو اپنی فوج بھیجنی پڑی جو جنگ کا رنگ اختیار کر گئی ہے۔ ان کی تقریر کے بعد اجلاس دو دن کے لیے ملتوی ہو گیا۔ ’دوسرے اجلاس میں، میں نے جوابی تقریر میں کہا کہ ہندوستان کے نمائندے نے اپنی تقریر میں عمداً اس قضیے کی پیچیدگیوں کو پس پردہ رہنے دیا ہے اور صرف پاکستان کے خلاف الزامی پہلو پر زور دیا ہے۔ ہماری طرف سے اس اہم اور پیچیدہ قضیے کے پس پردہ حالات کو ظاہر کرنا اور ہندوستان کو مجرم کی حیثیت میں دکھانا ضروری ہے اس لیے لازماً بہت سے امور کی وضاحت ناگزیر ہے جن کا بیان ہندوستان کی طرف سے اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ ان کے خلاف جاتے ہیں۔‘

’ان تمام واقعات کا مختصر بیان بھی وقت چاہتا تھا اور سلامتی کونسل کے ایک اجلاس میں تقریر کے لیے صرف سوا دو گھنٹے میسر آتے تھے اس لیے تقریر تین اجلاسوں میں مکمل ہوئی۔‘

’چند سال بعد کولمبیا کے نمائندے نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کشمیر کے معاملے میں ہندوستانی نمائندے کی پہلی تقریر سننے کے بعد سلامتی کونسل کے اراکین کی کثرت کا یہ تاثر تھا کہ پاکستان نے آزادی حاصل کرتے ہی فساد کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور دنیا کے امن کے لیے ایک خطرے کی صورت پیدا کر دی ہے، لیکن جب جواب میں تمہاری طرف سے اصل حقیقت کے رُخ سے پردہ ہٹایا گیا تو ہم سب نے سمجھ لیا کہ ہندوستان مکاری اور عیاری سے کام لے رہا ہے اور کشمیر کی رعایا پر ظلم ہو رہا ہے اور ہمارا یہ تاثر بعد میں کسی وقت بھی زائل نہیں ہوا۔‘ 20 جنوری 1948 کو اقوام متحدہ نے کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کشمیر کمیشن کے قیام کی قرارداد منظور کر لی۔ یہ قرارداد بیلجیئم نے پیش کی تھی۔ اس کمیشن کا پورا نام یونائیٹڈ نیشنز کمیشن آن انڈیا اینڈ پاکستان (UNCIP) تھا لیکن عرف عام میں یہ ’کشمیر کمیشن‘ کے نام سے ہی مشہور ہوا۔

کمیشن کے ارکان کی تعداد پانچ تھی۔ طے پایا کہ اس کمیشن میں دو ارکان سلامتی کونسل نامزد کرے اور وہ دونوں ارکان ایک تیسرا رکن نامزد کریں۔ ان کے علاوہ ایک رکن پاکستان اور ایک انڈیا نامزد کرے۔ سلامتی کونسل نے بیلجیئم اور کولمبیا کو نامزد کیا اور دونوں نے امریکا کو نامزد کیا۔ پاکستان نے ارجنٹائن کو اور بھارت نے چیکوسلواکیہ کو نامزد کیا۔

سر ظفر اللہ خان نے ’تحدیث نعمت‘ میں لکھا ہے کہ ’کمیشن کے سپرد جو کام کیا گیا تھا وہ نہایت ہی اہم اور بہت ذمہ داری کا تھا لیکن نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ متعلقہ حکومتوں نے اس کام کی اہمیت کو مناسب وقعت نہ دی اور اپنے نمائندوں کے انتخاب میں نہایت سہل انگاری سے کام لیا۔‘‘ کمیشن کے اراکین بلاشبہ شرفا تھے لیکن سیاسی سوجھ بوجھ، ہمت اور

حوصلے کے لحاظ سے اس درجہ تک نہیں پہنچے تھے جو ان کے فرائض کی کما حقہ ادائیگی کے لیے ضروری تھا۔ ان میں سے صرف ایک رکن ان خوبیوں کے مناسب حد تک حامل ثابت ہوئے جو ان کے فرائض کی کامیاب ادائی کے لیے لازم تھیں، وہ چیکوسلواکیہ کے نمائندے ڈاکٹر جوزف کوربیل تھے جنھوں نے کمیشن سے علیحدگی کے بعد کمیشن کی سرگرمیوں کے متعلق ایک کتاب Danger in Kashmir شائع کی۔'

'بیلجیئم کے پہلے نمائندے ایک عمر رسیدہ نواب تھے جنھیں صرف کھانے پینے اور سونے سے سروکار تھا اگر کسی وقت کمیشن کے کام کی طرف توجہ فرماتے تو یہ دیکھنے کے لیے کہ کمیشن کا کوئی اقدام پنڈت جواہرلال نہرو کی طبع نازک پر گراں تو نہیں ہوگا۔'

'ریاست ہائے متحدہ امریکا کے نمائندے کچھ توجہ فرماتے تھے لیکن ان کی شرافت ان کی ہمت پر غالب تھی۔ کولمبیا کے نمائندے ڈاکٹر کوربیل سے دوسرے درجے پر تھے اور انھوں نے اپنی زندگی کا کچھ ثبوت دیا لیکن ان کے لیے بڑی مشکل تھی کہ ان کی انگریزی زبان کی واقفیت بہت محدود تھی۔ ڈاکٹر کوربیل ۱۹۴۹ کے شروع میں کمیشن سے علیحدہ ہو گئے ان کی علیحدگی کے بعد کمیشن نیم مردہ ہو گیا اور تھوڑے عرصے بعد اس نے دم توڑ دیا۔'

سنہ ۱۹۵۳ میں جب احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی ملک گیر تحریک چلی تو اس تحریک کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ سر ظفر اللہ خان کو ان کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے اور احمدیوں سے تمام کلیدی عہدے چھین لیے جائیں۔

سر ظفر اللہ خان پر الزام تھا کہ انھوں نے باؤنڈری کمیشن میں مسلم لیگ کا مؤقف درست طریقے سے پیش نہیں کیا جس کی وجہ سے گورداس پور کا علاقہ ہندوستان میں شامل ہو گیا، مگر اس تحریک کے معاملات کا جائزہ لینے کے لیے جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم آر کیانی کی صدارت میں جو کمیشن قائم کیا گیا اس میں جسٹس محمد منیر نے اس الزام کو مسترد کر دیا۔

نومبر ۱۹۵۳ میں عالمی عدالت انصاف کے ایک جج سر بی این راؤ، جن کا تعلق انڈیا سے تھا، وفات پا گئے۔ ان کی جگہ پوری کرنے کے لیے اقوام متحدہ نے مختلف ممالک سے کہا کہ وہ موزوں امیدواروں کے نام اقوام متحدہ کو بھیج دیں۔

پاکستان نے اس سلسلے میں سر ظفر اللہ خان کو اور انڈیا نے مسٹر جسٹس پال کو اپنا نمائندہ نامزد کیا۔ سات اکتوبر ۱۹۵۴ کو سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی میں پولنگ ہوئی۔ نتیجہ سر ظفر اللہ خان کے حق میں نکلا۔ سلامتی کونسل میں ان کے حق میں پانچ کے مقابلے میں چھ ووٹ اور جنرل اسمبلی میں ۲۹ کے مقابلے میں ۳۳ ووٹ آئے اور یوں وہ عالمی عدالت کے جج منتخب ہو گئے سر ظفر اللہ خان اس سے قبل ۳۰ جون ۱۹۵۴ کو پاکستان کی وزارت خارجہ سے مستعفی ہو چکے تھے اور عالمی عدالت میں اپنے انتخاب کے وقت اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کی قیادت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

سنہ ۱۹۵۸ میں وہ اس عالمی عدالت کے نائب صدر منتخب ہوئے، سنہ ۱۹۶۱ میں جب وہ اس عہدے سے سبکدوش ہوئے تو انھیں ایک مرتبہ پھر اقوام متحدہ میں پاکستان کا مستقل مندوب مقرر کر دیا گیا جہاں ۱۸ ستمبر ۱۹۶۲ کو وہ جنرل اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے۔

سر ظفر اللہ خان اس عہدے پر ستمبر 1963 تک فائز رہے۔ اس کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر عالمی عدالت کے جج منتخب ہوئے بعد ازاں وہ 1970 سے 1973 تک اس عدالت کی صدارت پر بھی فائز رہے۔ ان کی سبکدوشی کے بعد پاکستان کے اس وقت کے صدر ذوالفقار علی بھٹو نے انھیں ایک شاندار تہنیتی پیغام ارسال کیا جو 18 مارچ 1973 کو پاکستان بھر کے اخبارات میں شائع ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ 'جنرل اسمبلی کے صدر اور بین الاقوامی عدالت انصاف کے جج کی حیثیت میں آپ نے پوری انسانیت کی ہی خدمت نہیں کی بلکہ پاکستان کے وقار کو بھی بلند و بالا کیا۔ آپ کو مختلف حیثیتوں میں عالمی برادری اور اقوام متحدہ میں جو تکریم ملی ہے اس پر ہم سب کو فخر ہے۔'

سر ظفر اللہ خان چھ فروری 1893 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے وہ وائسرائے ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہے تھے۔ وہ واحد پاکستانی شخصیت ہیں جو نہ صرف جنرل اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے بلکہ عالمی عدالت انصاف کے سربراہ بھی رہے۔

سر ظفر اللہ خان کی وفات یکم ستمبر 1985 کو لاہور میں ہوئی اور وہ ربوہ ضلع جھنگ میں آسودہ خاک ہوئے۔ ان کی وفات کی خبر ملتے ہی اقوام متحدہ کا سیکریٹریٹ بند کر دیا گیا اور تین ستمبر ۱۹۸۵ کو اقوام متحدہ کا پرچم سرنگوں رہا۔ ان کی وفات پر نہ صرف صدر مملکت جنرل ضیا الحق اور وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے بلکہ عالم اسلام کے کئی سربراہان مملکت، اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل جے ویر پیریز دی کوئیار اور عالمی عدالت انصاف کے صدر نجندر سنگھ نے بھی تعزیتی پیغامات ارسال کیے۔

سر ظفر اللہ خان کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں ان کی خودنوشت سوانح عمری 'تحدیث نعمت' کا نام سرفہرست ہے۔ (بشکریہ بی بی سی)

❁❁❁

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جا رہا ہے۔

پاکستانی طلبہ سائنس سے بیزار کیوں ہیں؟

تحریر: پرویز ہود بھائی

اگرچہ سائنس سکولوں کے نصاب میں لازمی مضمون ہے لیکن بہت کم پاکستانی نوجوان سائنس سیکھنا چاہتے ہیں اور سائنس دان بننے کے خواہشمند نہ ہونے کے برابر ہی ہیں۔عرصہ دراز سے سائنس کو اتنا کراہت انگیز اور خشک مضمون گردانا جاتا ہے کہ اب لوگ سائنس جو کہ انسان کی سمجھ اور اس کی ترقی کی ضامن ہے سے نہ صرف بیزار ہو چکے ہیں بلکہ سائنس کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔

اگرچہ ہمارے ذہین طلبہ یقیناً سائنس سے متعلق شعبوں مثلاً انجینیئر نگ، طب،انفارمیشن ٹیکنالوجی وغیرہ میں کچھ حد تک کامیاب رہتے ہیں مگر سائنسی میدان میں کم علمی انہیں ان ارتقا پزیر شعبوں میں جدتیں لانے سے مانع رکھتا ہے۔

اس صورت حال کا تقابل ہندوستان سے کیجیے، یہ دیکھیے کہ مختلف سروے یہ بتاتے ہیں کہ وہاں کے طلبہ سائنس کو سب سے زیادہ شاندار اور باوقار پیشہ سمجھتے ہیں۔ان کے لئے آئن سٹائن، سٹیفن ہاکنگ،بلیک ہول،جینیات وغیرہ پڑھنا اصل میدان ہے۔اگرچہ وہاں پر بھی زیادہ تر طلبہ بالآخر گھسے پٹے پیشے ہی اختیار کرتے ہیں جو ہمارے طلبہ کرتے ہیں لیکن پھر بھی ان میں سے نوجوانوں کی ایک اچھی تعداد سائنس کو اپنا کریئر بناتے ہیں اور کچھ دنیا کے اچھے سائنس دانوں میں شمار بھی ہوتے ہیں۔ابھرتی ہوئی عالمی طاقت بننے میں ہندوستان کے ایسے لوگوں کا بھی ہاتھ ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ خاصی حد تک تو اس کا جواب ہمیں ہماری سائنسی نصابی کتب دیکھ کر مل سکتا ہے اگرچہ اس کا کچھ الزام ہمارے غیر فعال نظام امتحانات اور سائنس کے نااہل اساتذہ کو بھی جاتا ہے۔ایسے کلچر میں جہاں لکھے کو حرف آخر سمجھا جاتا ہے وہاں بے کار نصابی کتب ہماری سائنس میں ناکامی کی بہت بڑی ذمہ دار ہیں۔

پچھلے کئی سالوں میں میں نے بہت سی اردو اور انگریزی کی نصابی کتابیں اکٹھی کی ہیں۔اردو کتابیں تو انگریزی کتابوں سے بھی گئی گزری ہیں۔یہ تمام کتابیں پنجاب اور سندھ کے نصابی کتب کے بورڈز نے شائع کی ہیں جن کی کروڑوں کاپیاں فروخت چکی ہیں۔ان کتابوں سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید سائنس کو جغرافیہ یا تاریخ کی طرز پر پڑھانا ہی کافی ہو گا۔

اگرچہ ان کتابوں کے سرورق کے اندر والے صفحے پر قائدِ اعظم کی ایک سنجیدہ سی تصویر بچوں کو یہ یاد دلاتی ہے کہ اگر ہم نے تعلیم حاصل نہ کی تو ہمارا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔لیکن ایسی دھمکیاں یا یہ کہنا کہ ’علم سیکھنا ایک مذہبی فریضہ ہے جس سے ہمارے آخرت میں کامیابی کے امکان بڑھ جائیں گے‘ بے فیض ثابت ہوتے ہیں جس مضمون کا کھوا انسانی تجسس سے چھوٹا ہوا اس میں بچوں کی دلچسپی ایسی باتوں سے بڑھائی نہیں جاسکتی۔

مقامی کتابیں اس انسانی تجسس کے فروغ کی بجائے اس کے قتل کا باعث ہیں۔ریاضی کی کتابوں میں بے مقصد اور بے فیض مشقیں کرائی جاتی ہیں اور طبیعات، کیمیا، اور حیاتیات کے مضامین میں صرف فارمولے اور اشکال یاد کرنے پر زور ہوتا ہے۔چاہے یہ کتابیں نئے سرے سے لکھی گئی ہوں یا کاٹ چھانٹ کر مواد اکٹھا کر کے بھان متی کا کنبہ جوڑا گیا ہو، انہیں پڑھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ علم انسان کی مسلسل کوشش اور ذہانت کی وجہ سے پھلتا پھولتا ہے۔

گھسا پٹا طرز تدریس آپ کو ان کتابوں میں جگہ جگہ ملے گا۔مثال کے طور پر سطحی تناؤ کے بارے میں انتہائی ناقص طریقہ یہ کہنا ہو گا کہ ’سطحی تناؤ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ مالیکیولز کی باہمی کشش کی وجہ سے مائع کی سطح پر ایک چادر سی بن جاتی ہے۔‘ یاد رکھیے کہ آج تک نہ تو کسی نے کوئی مالیکیول دیکھا ہے اور نہ ہی دو مالیکیولز کے درمیان پائی جانے والی کشش کو۔چنانچہ جو طالب علم اس طریقے سے سیکھتا ہے اس نے گویا کچھ نہیں سیکھا۔

اس کے برعکس، زیادہ موثر طرز تدریس یہ ہو گا کہ طالبِ علم سے یہ کہا جائے کہ وہ سطح آب پر ایک ریزر بلیڈ کو رکھے اور پھر یہ بتائے کہ یہ ڈوبنے کی بجائے تیر کیوں رہا ہے۔اس سے طالبِ علم خود سوچنے پر مجبور ہو گا کہ غالباً کوئی نظر نہ آنے والی پرت ہے جو اسے ڈوبنے سے روکتی ہے۔صابن کے ایک قطرے سے یہ چادر کمزور پڑ جاتی ہے اور بلیڈ ڈوب جاتا ہے۔ایسے منطقی طرز تدریس سے طالب علم اس عمل کا منطقی استدلال کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔

ان کتابوں کا سب سے ناقص حصہ ہر باب کے آخر میں دیے گئے سوالات اور مشقیں ہیں جن میں محض یادداشت پر زور دیا جاتا ہے۔مصنفین کو غالباً یہ علم نہیں ہے کہ سائنس کی بنیاد ہی پہلے سے ان دیکھے مسائل کو حل کرنا ہے چنانچہ اچھی سائنسی تعلیم کا مقصد بھی یہ ہونا چاہئے کہ طلبہ کو نئے سیکھے گئے سائنسی اصولوں کی سمجھ ہو اور وہ ان دیکھے سائنسی مسائل کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کے قابل ہو جائیں۔ان کتابوں کے برعکس غیر ملکی مصنفین کی کتابوں میں جو کہ پاکستان میں بہترین سکولوں میں اولیول کے لئے پڑھائی جاتی ہیں مشقیں قدرے بہتر ہیں۔

جدید کتابوں کے مواد میں کچھ بہتری ضرور آئی ہے۔پچھلی کتابوں کی نسبت آج کی کتابوں میں سائنسی اصولوں کے بارے میں غلط بیانی اور گرامر کی غلطیاں قدرے کم ہیں۔اس کے علاوہ بہتر چھپائی اور رنگین تصاویر اب زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔لیکن محض حقائق کا ملغوبہ بنا کر پیش کر دینا نوجوان ذہن کو سیکھنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارا اصل مسئلہ سرمائے کی کمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نصابی کتب کی تصنیف اور اشاعت ایک منافع بخش کاروبار ہے کیونکہ ان کتابوں کی طلب بہت زیادہ ہے۔ منافع بٹورنے کے لئے نااہل لوگوں کو کتابوں کے مصنفین میں زبردستی شامل کرلیا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پنجاب نصابی کتب کے بورڈ کی شائع کی گئی دسویں جماعت کی ریاضی کی کتاب کے چھ مصنفین ہیں اور محض ۱۸۷ صفحوں پر مشتمل دسویں جماعت کی کیمیا کی کتاب کے آٹھ مصنفین ہیں۔ چنانچہ جہاں منافع اتنے سارے لوگوں میں بٹتا ہے وہیں غیر معیاری کام کا الزام بھی دوسروں پر تھوپ کر خود کو بری الذمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس معاملے میں شاید سخت قوانین بھی فائدہ مند ثابت نہ ہوں۔ اپنے ملک میں لکھی گئی کتابوں کے غیر معیاری ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کے قومی کلچر میں سائنس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ ٹیلی ویژن پر دن رات سیاسی شعبدے بازی تو ہوتی ہے لیکن سائنس کے بارے میں ایک بھی معیاری پروگرام ہمارے ہاں نہیں بنتا۔

لاہور کے ایک سائنسی عجائب گھر کے علاوہ ملک میں اور کوئی عجائب گھر سائنس کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ ہمارے ہاں سائنس کی بنیادی سمجھ اتنی کم ہے کہ اکثر لوگ نقل زدہ ایٹم بم بنانے کو ڈاکٹر عبد السلام کے اس عظیم سائنسی کام سے جس پر انہیں نوبل انعام سے نوازا گیا، بہتر سمجھتے ہیں۔

اس مسئلے کا ایک حل موجود ہے۔ سائنس کی بہترین کتابیں جو پاکستان کے بہترین سکولوں میں اولیول کے طلبہ کو پڑھائی جاتی ہیں پہلے سے ہی موجود ہیں۔ یقیناً ان کتابوں کا ترجمہ اور مناسب ترامیم کر کے انہیں میٹرک کے طلبہ کی تعلیم کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگر ان کتابوں کے مصنفین میں کوئی پاکستانی بھی شامل ہو تو سمجھئے سونے پر سہاگہ ہے۔ کتابوں کا معیار ہی ان کے انتخاب کا ضامن ہونا چاہئے۔ مصنف کی قومیت سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے۔

بدقسمتی سے ایسے مواقع پر ہماری قومی حمیت جاگ اٹھتی ہے۔ ایسے بیانات دیے جاتے ہیں کہ پاکستانی بھی اتنی ہی معیاری کتابیں لکھ سکتے ہیں جتنی کہ غیر ملکی مصنفین چنانچہ ہمیں غیر ملکی کتابوں پر انحصار نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن اس معاملے میں حد سے بڑھی قومی حمیت کام نہیں آتی کیونکہ سائنسی میدان میں ابھی ہم بہت پیچھے ہیں۔

ان حالات کو بدلنے کے لئے قوی ارادے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا کہ ملکی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں غیر ملکی مصنفین کی کتابوں کا مقابلہ نہیں کر پاتیں۔ اگر ہم غیر ملکی ادویات، کمپیوٹر اور سمارٹ فون استعمال کر سکتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے جہازوں میں سفر کر سکتے ہیں تو پھر ان کی کتابیں استعمال کرنے میں کیا حرج ہے۔ ہمیں اپنی جھوٹی انا اور غلط خیالات کو ترک کرنا ہوگا۔ عاجزی دکھانا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن پاکستان کو مستقبل میں سائنسی طور پر تعلیم یافتہ بنانے کے لئے یہ شاید بہت چھوٹی قیمت ہوگی۔

❁❁❁

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED
CHARTERED ACCOUNTANTS
WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

Company Incorporation / Registered Office Address
Private UK Pension Tracing
Personal Income Tax Return investigations
Assets Review for Inheritance Tax
Rental Income Tax Returns
Appealing - Past years HMRC Penalties
UK State Pension Entitlement Review
Preperation / Filing of prior year tax returns
Advise on fil l ing Gaps in UK State Pension
Duplicate - Payslips / P60s
UK State Pension / (Contracted Out) Tracing

SARMAD KHAN | ACA, FCCA
OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK
CELL +44 (0)7903 416 966
TEL +44 (0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002
EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM WEB WWW.SARMADGLOBAL.COM

نقش سارے مٹا ڈالے تھے گولی نے!

تحریر: رضوان طاہر مبین

یاد نہیں کہ اُس دن کس وجہ سے میں اسکول نہیں گیا تھا، اسی سبب کچھ دیر سے سو کر اٹھا۔ دوپہر ۱۲ بجے تک یہ ایک معمول کا دن تھا۔ یک دم ابو نے باہر سے آکر یہ خبر دی کہ 'حکیم سعید کو قتل کر دیا گیا ہے!'

یہ سنتے ہی میں دوڑ کر تین چار گلی آگے لگے ہوئے ایک اخبار کے اسٹال کی طرف دوڑا جسے شام کے اخبارات کی سرخیاں پڑھنے والوں نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ میں نے اُچک کر کسی طرح اخبارات کی پیشانی دیکھنے کی کوشش کی۔ شام کے ہر اخبار کی سرخی ایک ہی اَلم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سرخیاں پڑھنے والے دم بخود قارئین تھوڑی دیر رکتے اور پھر ایک دوسرے سے نگاہیں چُرا کر اپنی راہ لے لیتے۔ میں نے مٹھی سے ۳ روپے نکال کر دھرے اور عوام اخبار لے کر آ گیا، جس کی سرخ لوح کی لالی اُس دن حکیم محمد سعید کی خونم خوں تصویر سے پورے اخبار اور پھر چھلک کر پورے شہر تک پھیلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

میرے شعور کا یہ پہلا موقع تھا کہ گھر میں ہم سب یوں سہمے بیٹھے تھے جیسے کسی خونی رشتے سے جڑا کوئی اپنا کھو دیا ہو۔ سب سے زیادہ رنج گھر کے کونے میں اپنے تخت پر بیٹھی امّاں (نانی مرحومہ) کو تھا۔ وہ مطالعے کی دَھنی اور حکیم سعید کے اخلاق و کردار کی بہت زیادہ گرویدہ تھیں۔ اس دن وہ آہیں بھر کر اُن کے سچ بولنے کو اُن کے قتل کا سبب بتاتی رہیں اور پھر کئی دنوں تک وہ ہر آنے جانے والے سے اِس روح فرسا واقعے کا پرسہ کرتی رہیں۔

میں نے اپنی لکڑی کی دراز میں جمع بہت سے نونہال رسالے نکالے اور اخبار میں آئی تصویر کو اُن کی ہر تصویر سے ملانے کی کوشش کی تھی۔ نونہال میں ہر تصویر سیاہ جناح کیپ اور سفید برّاق شیروانی میں تھی، مگر اخبار میں بقول جامعی صاحب 'نقش سارے مٹا ڈالے تھے گولی نے!' اب سر پر ٹوپی تھی نہ لباس میں سفیدی، بے ترتیب بالوں میں لہو اُن کے اُجلے لباس تک آ گیا تھا۔ میں نے ہر زاویے سے دونوں تصاویر کو ملا کر دیکھا، مجھے وہ کہیں سے نونہال میں شایع ہونے والے حکیم سعید نہ لگے۔ مگر خبر کا مصدقہ ہونا مجھے افسردہ کرتا تھا۔ صفحۂ اول پر اس وقت اُن کے روزے سے ہونے، سارے راستے خاموش رہنے، گھات لگا کر بیٹھے دہشت گردوں اور پھر ٹھیک ۶ بج کر ۲ منٹ پر دفتر پہنچنے کے جلی الفاظ نوحہ کناں تھیں۔

اس سے کچھ برس پہلے ہی کی تو بات ہے جب میرا ریاضی کا پرچا تھا سڑک کنارے واقع اسکول میں، میں نے بہت زوردار گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں، پھر باہر ہونے والی افراتفری کو آوازوں سے محسوس کرنے کی بھی کوشش کی تھی، گھر پہنچ کر پتا چلا کہ شہر میں حکیم سعید کے قتل کی اطلاعات پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر شکر کیا تھا کہ یہ افواہ تھی۔ مگر آج تو یہ سب بپا ہو چکا تھا اور جب ہمیں پتا چلا تو اس قیامت خیز لمحے کو گزرے ہوئے بھی ۶ گھنٹے ہو چکے تھے۔ اخبار میں رات سے آکر اُن کے انتظار میں بیٹھنے والے مریضوں کی آہ و بکا کا بیان بھی تھا۔ وہ فقط 'طب' کے نہیں بلکہ پورے سماج کے طبیب تھے، وہ سماج جو روز بہ روز اخلاقی زوال کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔ یہ طبیب اس کی ہر ایک بیماری کو نگاہ میں رکھ کر اس کا علاج تجویز کرتا تھا۔ سماج کے ان بیماروں کی آہ و بکا جانے اس دن کے اخبار نے کیوں رقم نہ کی۔

میرا حکیم سعید سے رشتہ صرف نونہال کے قاری کے طور پر رہا۔ لیکن اُن کے قتل کے بعد میں نے اُن کی ڈھیر ساری کتابیں پڑھ کر ان سے طویل ملاقاتیں کیں، گویا دنیا سے چلے جانے کے کچھ برس بعد میں نے اُن کی تحریروں سے تربیت پائی، اس لیے آج انہیں اپنا عظیم استاد خیال کرتا ہوں۔ نئی نسل اُن کا عشق تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے ادارے 'ہمدرد' کی جانب سے باقاعدہ ایک شعبہ 'نونہال ادب' قائم کیا، جس میں خود انہوں نے بھی لاتعداد کتابیں لکھیں۔ بالخصوص اُن کے سفرنامے تو ناقابلِ فراموش ہیں۔ وہ ہر قدم پر اپنے وطن کے نونہالوں کو ساتھ رکھتے، میں بھی اُن کی انگلی پکڑ کر ایسے دسیوں سفر پر نکلا ہوں، جہاں انہوں نے اخلاقیات سے لے کر سماجیات تک، ہر چیز کا نظارہ کروایا اور رہنمائی فرمائی۔ شاید ہی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا ہو، جہاں انہوں نے خوب زور دے کر یا کبھی سرگوشی کے انداز میں کچھ نہ کچھ ہمارے ذہنوں میں نہ انڈیل دیا ہو۔

نونہالوں کا غیر تعلیم یافتہ ہونا انہیں بہت آزردہ کرتا۔ بچپن کے کسی لمحے میں پڑھے یہ خیالات آج بھی ازبر ہیں، وہ کہتے کہ 'دیکھو اگر ملک کے یہ دولت مند اپنی تھوڑی سی دولت صرف کر دیں، تو تمہارے ملک کا کوئی نونہال تعلیم سے محروم نہ رہے۔' حکیم سعید کے ایک لباس اور ایک زبان کی تبلیغ سے ہم بھی فوری متاثر ہوئے۔ وہ 'ایک ناشتہ ایک کھانا' کے قائل تھے۔ پاکستان کی گولڈن جوبلی تقریبات پر ہونے والے اخراجات نے انہیں تڑپا دیا تھا، کیوں کہ وہ سادگی کے علم بردار تھے۔ شادی ہالوں میں پیسے کا ضیاع دیکھ کر بے چین ہو جاتے۔ اپنی تحریر لکھتے ہوئے کبھی باہر پٹاخوں کی آواز آئی تو انہوں نے پھر نونہالوں کو سمجھایا۔ اُن کی یہ بات مجھے بالکل نہیں بھولتی کہ 'قوم کو تِکہ بوٹی کھانے میں لگا دیا گیا۔ آنے والے وقتوں میں ہماری تِکہ بوٹی ہونے والی ہے!' حکیم محمد سعید مشرقی طب پر پختہ یقین رکھتے۔ اس کی حقانیت، جدید تحقیق کے تناظر میں اس کے لیے اپنی جد و جہد سے لے کر جدید ادویہ کے مضر اثرات پر کھل کر بات کرتے اور سارے تلخ و ترش واقعات درج کرتے جاتے۔

نونہالوں کے لیے انہوں نے سیاسی نظریے کا میدان بھی خالی نہ چھوڑا۔ وہ واضح طور پر کہتے کہ اسلام میں کسی 'ازم' کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ بچوں کی ٹافیاں کھانے کی عمر میں انہیں

معیشت کی اتنی پکی باتیں بتانا ضروری سمجھتے کہ ملک مقروض ہو رہا ہے اور اس کا حل اب صرف یہ ہے کہ ہم دنیا میں خود کو دیوالیہ کہہ کر سارے واجبات سے جان چھڑا لیں۔ ساتھ یہ آگاہی بھی دیتے کہ ہم غیر ملکی مصنوعات خرید خرید کر اپنی معیشت تباہ کر رہے ہیں۔

کتابوں میں انہوں نے اپنے سیاسی تجربات بھی پوشیدہ نہ رکھے۔ وہ جنرل ایوب اور ضیا کے مشیر رہے۔ اُن کی 'ہمدرد یونیورسٹی' کے چارٹر کے لیے کس کس طرح رکاوٹیں ڈالی گئیں، انہوں نے اس حوالے سے سب لکھ دیا۔ وہ ٦ ماہ کے لیے گورنر سندھ بھی بنے، بتاتے ہیں کہ یہ وقت کس مشکلات سے گزرا۔ اس دوران انہوں نے کتنی جامعات کے چارٹر دے ڈالے۔ تعلیم کے دشمنوں سے وہ اعلان بغاوت کرتے اور ننھے بچوں کو اپنی کسی فوج کی طرح انقلاب کے لیے تیار کرتے جاتے۔ وہ اُن کے سادہ ذہنوں میں سچائیوں کی بغاوت بھرتے چلے جا رہے تھے، اس دیس کے ہر دشمن کے چہرے سے نقاب نوچ رہے تھے۔

ان کی کتابیں مجھے اُن پر کسی 'فرد جرم' کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ یہ جرم کہاں تک برداشت کیا جاتا؟ آج سے ٢ عشرے قبل کراچی میں نامعلوم افراد کے نام پر حکیم محمد سعید کا خاتمہ کر دیا گیا مگر ان کا قلم آج بھی بدستور اس قوم کو جگا رہا ہے، کاش یہ قوم بھی جاگنا چاہتی۔

قارئین کے لیے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور انٹرنیشنل نے قارئین کے لیے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے "ادارہ" پُر عزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاءاللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدردانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد "ہفتہ وار" کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔

ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے" ملاہور رسالہ ہر دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بزنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپکی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہوگی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بنک میں جمع کروا سکتے ہیں۔ اللہ تعالی آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account No:
42534160
Sort Code:
30-96-26
IBAN: GB89Loyd
3096242534160

ایک فالج زدہ نومسلم کا واقعہ

تحریر: حکیم محمد عمران مغل

لاہور میں بھاٹی چوک انتہائی پر رونق اور تاریخی جگہ ہے جہاں دلچسپ واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ سامنے ہی حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کا مرقد ہے جہاں فاتحہ خوانی کے لیے ہر وقت عوام وخواص کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ سفید پوش، درویش اور بد اندیش ہر ایک نے یہاں اپنی حاضری لگانی ہوتی ہے۔ ایک دن میں جونہی بھاٹی چوک کے وسط میں پہنچا تو بیچ چوراہے کے ایک نوجوان نے مجھے روک لیا جیسے وہ برسوں سے مجھے جانتا ہو۔ کہنے لگا کہ یہ عورت میری بیوی ہے جس کے سہارے میں چل پھر رہا ہوں۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس پر فالج کا دردناک حملہ ہو چکا ہے۔ بتانے لگا کہ میں ایک عرصہ سے عیسائیت سے تائب ہو کر مسلمان ہو چکا ہوں۔ میری کس مپرسی دیکھ کر ایک دردمند مسلمان نے کوٹھا پنڈ (ملحق ماڈل ٹاؤن) میں ایک فلیٹ میرے نام الاٹ کر دیا ہے۔ بعض دیگر مسلمان بھائیوں نے میرا وظیفہ بھی مقرر کیا ہے، مگر اللہ کی طرف سے آزمائش میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ ہر طرح کے علاج معالجہ کے باوجود فالج کا اژدہا مجھے نگلتا جا رہا ہے۔ کسی صاحب نے آپ کی نشان دہی کی ہے۔ اگر آپ میرے حالات پر نظر کرم فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ:

رومی نہیں، حافظ نہیں، اقبال نہیں ہیں
کچھ آپ سے بہتر تو بہر حال نہیں ہیں

کس نے میری نشان دہی کر دی؟ لیکن نومسلم کی لجاجت حد سے بڑھتی جا رہی تھی، جبکہ میرے پاس اس کی خواہش کی تکمیل کا کوئی حیلہ نہ تھا۔ اس کی نوجوان بیوی کہنے لگی کہ آپ اس وقت ہمارے آخری مسیحا اور وسیلہ ہیں، ہمیں مایوس نہ کریں۔ میں نے سوچا کہ بھیجنے والا یقیناً مجھے جانتا ہوگا۔ اس وقت میری جیب کے ساتھ ذہن بھی خالی تھا، لیکن اس نومسلم جوڑے کو خالی ہاتھ بھیجنا بھی مناسب نہ تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر عبداللہ جہانیاں والے رحمۃ اللہ علیہ کے ہر دلعزیز فرزند ارجمند جناب حکیم عبدالوحید سلیمانی کے دواخانہ پر نظر پڑی جن سے ایک عرصہ سے میری شناسائی تھی۔ میں نے حکیم صاحب کے کتب خانہ کی کوئی کتاب نہیں چھوڑی جس کا میں نے مفت مطالعہ نہ کیا ہو، لیکن انھوں نے میرے حالات دیکھ کر کبھی ماتھے پر شکن نہیں ڈالی۔ ان کی فیاضی کی انتہا تھی کہ ایک موقع پر مجھے پیشاب میں کالے رنگ کے لاتعداد چھلکے آنے لگے تو میری داستان سن کر وہ گھبرا گئے اور کہا کہ آپ کو پتہ نہیں کہ آپ کس مرض میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ فوراً بے قراری کے ساتھ انھوں نے ایک نہایت قیمتی نسخہ مرحمت فرمایا۔ اس قسم کی بے بہا خوبیاں جہانیاں کا خاندان اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

خیر، حکیم صاحب کے دوا خانے پر نظر پڑتے ہی جان چھڑانے کی ایک ترکیب سوجھ گئی۔ میں نے کاغذ کے ایک پرزے پر لکھا کہ یہ نومسلم نوجوان آپ کی توجہ کا مستحق ہے۔ اگر آپ نے فیاضی کا مظاہرہ کیا تو بہت ممکن ہے کہ آپ کے ہاتھوں اس نومسلم جوڑے کی دنیا سنوار جائے۔ نیچے میں نے اپنا نام لکھ دیا۔ چٹ اس نومسلم کو دی کہ یہ سامنے حکیم صاحب بیٹھے ہیں، جا کر ان کو دے دیں۔ ساتھ ہی میں نے اپنی سمجھ کے مطابق ریٹھے کا نسخہ بھی بتا دیا۔ میری خواہش تھی کہ کسی بھی آبرومندانہ طریقے سے میری جان چھوٹ جائے اور کچھ نہ کچھ ان کے درد کا بھی مداوا ہو جائے۔ غالباً چار ماہ کے بعد اچانک اسی نوجوان مسلم جوڑے سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی۔ میں نے حال احوال پوچھا تو کہنے لگا کہ ہاتھ ملائیں۔ میں نے ہاتھ ملایا تو کہنے لگا کہ اب ہاتھ چھڑائیں۔ میں واقعی اس کی گرفت سے اپنا پنجہ نہ چھڑا سکا۔ کہنے لگا کہ آپ کے ردی کے کاغذ پر لکھے گئے رقعے نے میری دنیا بدل دی۔ میں آپ کا رقعہ لے کر حکیم سلیمانی صاحب کے پاس گیا تو انھوں نے فوراً ایک چھوٹا سا لفافہ روپوں سے بھر کر کچھ ادویہ بھی مرحمت فرمائیں اور ساتھ ہی آپ کے نسخے کی تائید و تصدیق فرمائی اور کہا کہ میرے ساتھ رابطے میں رہیں۔ جب تک مرض ختم نہیں ہوتا، دوا برابر لیتے رہیں، مگر ایک ہی بار کے بعد پھر ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ حکیم صاحب نے میرے ایک معمولی کاغذ کے پرزے کو اتنی پذیرائی بخشی کہ میں شرم کے مارے آج تک ان کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔

❁❁❁

غامدی صاحب سے معذرت کے ساتھ

تحریر: یاسر پیرزادہ

ایک سوال کافی عرصے سے دماغ میں کلبلا رہا تھا، بالآخر اُس کا غیر تسلی بخش جواب مل گیا۔ سوال یہ تھا کہ کیا اسلام میں متغلب کی حکومت کے خلاف مزاحمت کرنا جائز ہے؟ متغلب کی حکومت سے مراد ایسی حکومت ہے جو اپنی طاقت کے بل بوتے پر غلبہ حاصل کرلے، اسے عوام کی تائید حاصل نہ ہو اور وہ کسی جمہوری طریقہ کار سے وجود میں نہ آئی ہو۔ اس سوال کا بالواسطہ جواب میرے پسندیدہ عالم دین جاوید احمد غامدی نے اپنے حالیہ خطبات میں دیا ہے جو انہوں نے یوٹیوب پر نشر کیے ہیں۔ اِن خطبات میں غامدی صاحب نے ہمیں سمجھایا ہے کہ قرآن میں مسلمانوں کے لیے ''وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ'' کا حکم ہے جو اسلام میں حکومت سازی کے لیے ایک زریں اصول ہے، اسی اصول کے تحت خلفائے راشدین کا انتخاب عمل میں لایا گیا، تاہم بعد جب میں اسلامی سلطنت وسیع ہوئی تو اِس اصول پر عمل کرنا ممکن نہ رہا اور یوں ملوکیت نے جنم لیا جو اُس وقت کے لحاظ سے بالکل درست طریقہ کار تھا۔ غامدی صاحب نے اپنے خطبے میں دو ٹوک انداز میں کہا کہ اُس دور میں ملوکیت کے اصول کو اپنانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا اور یہ بہترین فیصلہ تھا جو اُس وقت کیا گیا تاکہ مسلمانوں کو خانہ جنگی اور خوں ریزی سے بچایا جا سکے، اس فیصلے کے نتیجے میں ہی مسلمانوں کی وہ عظیم سلطنت برقرار رہی جس پر آج ہم فخر کرتے ہیں۔

غامدی صاحب نے اِس موضوع پر بہت طویل گفتگو کی ہے جو نو قسطوں میں یوٹیوب پر موجود ہے، میں یہاں اُس گفتگو کا خلاصہ بھی پیش نہیں کر سکتا۔ مختصراً غامدی صاحب کا استدلال یہ تھا کہ جب ایک حکومت قائم ہو جاتی ہے، چاہے وہ ملوکیت ہو یا مارشل لا، اسے تسلیم کرلیا جاتا ہے، وہ de facto حکومت ہوتی ہے، ایسی حکومت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اپنا نظم قائم کرے تاکہ کاروبارِ مملکت چلایا جا سکے اور لوگوں کے معمولاتِ زندگی میں ہیجان برپا نہ ہو اور معاشرے میں انارکی نہ پھیلے، ایسی حکومت کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ وہ ہر قیمت پر اپنی 'رِٹ' قائم کرے اور اس مقصد کے لیے اسے بعض اوقات سخت اقدامات بھی کرنے پڑتے ہیں۔

غامدی صاحب جیسے پائے کے عالم دین کے بارے میں بات کرتے ہوئے مجھے احتیاط کرنی چاہیے، میرا اُن سے بے حد احترام کا رشتہ ہے اور میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ غامدی صاحب سر تا پا 'ڈیموکریٹ' ہیں اور آج تاریخ کی درست سمت میں کھڑے ہیں۔ وہ جمہوریت کے حامی ہیں اور اختلاف رائے، رواداری، مساوات اور انسانیت کے احترام جیسے جمہوری اصولوں کے داعی ہیں۔ لیکن اپنے اِن خطبات میں انہوں نے جس طرح ملوکیت کی حمایت کی ہے اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ اگر ملوکیت کے نتیجے میں کوئی شخص اقتدار پر قبضہ کرلے اور وہ کسی عالم دین کو اپنا مقدمہ لڑنے کے لیے کہے تو وہ مقدمہ بالکل ویسا ہی ہوگا جیسا غامدی صاحب نے اِن خطبات میں پیش کیا ہے۔

اپنے موقف کی حمایت میں دلیل دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ووٹ اور بیعت میں فرق ہوتا ہے، جب حکومت قائم ہو جاتی ہے تو پھر اُس حکومت کے لیے بیعت کی شکل میں لوگوں سے اطاعت لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ خلط مبحث ہے۔ اسلامی حکومت تو قائم ہی اُس صورت میں ہوتی ہے جب لوگوں کی اکثریت نامزد خلیفہ کی بیعت کرلے، محض نامزدگی سے تو حکومت قائم ہی نہیں ہوتی۔ اُس دور میں نامزد خلیفہ کے لیے بیعت لینا ایسے ہی تھا جیسے آج کے دور میں نامزد وزیر اعظم کے لیے ایوان نمائندگان سے اعتماد کا ووٹ لینا ضروری ہے، اس کے بعد ہی حکمران حلف اٹھاتا ہے، منبر پر چڑھ کر اپنی ذمہ داریوں کا اعلان کرتا ہے اور پھر انتظامی احکامات جاری کرتا ہے، جیسا کہ ہر خلیفہ نے کیا، بیعت سے پہلے تو حکومت کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ یہاں ایک بات غامدی صاحب نے یہ بھی فرمائی کی اُس وقت عوام کا اجتماعی شعور اس سطح پر نہیں پہنچا تھا کہ وہ جمہوری انداز میں حکمران کا انتخاب کر سکیں، اس شعور تک پہنچنے کے لیے انسان کو کئی صدیاں لگیں۔ بے حد معذرت کے ساتھ، یہ وہی دلیل ہے جو آج آمریت کے حمایتی جمہوریت کے خلاف دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں کے جاہل عوام تو بریانی کی پلیٹ کے پیچھے اپنا ووٹ بیچ دیتے ہیں، یہ جمہوریت کے قابل ہی نہیں۔ پھر غامدی صاحب نے فرمایا کہ چاہے حکومت غیر آئینی ہی کیوں نہ ہو، متغلب کی ہی کیوں نہ ہو یا ملوکیت کے نتیجے میں ہی کیوں نہ قائم ہوئی ہو، ایسی حکومت کو تسلیم کرنا اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ امن وامان قائم رکھا جا سکے، خانہ جنگی اور خوں ریزی نہ ہو۔ یہ دلیل تو چودہ سو سال سے روزانہ اپنی موت آپ مر رہی ہے، مسلمانوں کو جس انتشار سے بچانے کی خاطر اِس دلیل کا سہارا لیا گیا اُس انتشار سے آج تک نجات حاصل نہ ہو سکی، غامدی صاحب سے بہتر یہ بات کوئی نہیں جانتا۔

انہوں نے واضح انداز میں تو نہیں کہا کہ متغلب کی حکومت کو جائز مان لینا چاہیے مگر ایسا کوئی طریقہ بھی نہیں بتایا کہ غاصب کے خلاف جدوجہد کب اور کیسے کی جاوے؟ یعنی اگر متغلب کی حکومت کا بیعت لینا بھی منطقی تھا، اس کا رِٹ قائم کرنا بھی ضروری تھا، حکومت کا نظم ونسق چلانے کے لیے مسلمانوں کے سر کاٹنا بھی مجبوری تھی تو پھر ایسا کون سا موقع آنا تھا جب متغلب نے تلوار نیام میں ڈال کر کہنا تھا کہ جناب والا اب آپ کو اجازت ہے میرے خلاف مزاحمت کر سکتے ہیں کیونکہ آج میں اچھے موڈ میں ہوں! ایسی حکومت تو قریش کی مکہ میں بھی قائم تھی، اسی ظلم کے خلاف تو اسلام آیا تھا۔ اگر غامدی صاحب والا بیانیہ مان لیا جائے تو پھر متغلب کی حکومت تو بلا روک ٹوک تاقیامت چلتی رہنی چاہیے اور ظلم کے خلاف مزاحمت کے اصول کو بھلا کر فقط استعاروں میں آزاد نظمیں لکھنی چاہئیں جس کو ظالم اور مظلوم دونوں اپنے حق میں سمجھیں۔ ایک اور دلیل انہوں نے یہ بھی دی کہ اُس وقت اسلامی مملکت اتنی وسیع ہو چکی تھی کہ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ کے اصول پر عمل کرنا ممکن

ہی نہیں رہا تھا۔ یہ بات بھی درست نہیں۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان کے دور میں بھی اسلامی سلطنت بہت وسیع تھی، صرف مدینہ تک محدود نہیں تھی، مگر انہوں نے اس اصول پر عمل کیا۔ حضرت علی سے وقتِ شہادت جب لوگوں نے پوچھا کہ کیا ہم امام حسن کی بیعت لے لیں تو آپ نے جواب دیا نہ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں اور نہ اس کا حکم دیتا ہوں۔

اس پورے مقدمے میں اگر غامدی صاحب کا استدلال درست مان لیا جائے تو پھر اسلام میں ظالم کے خلاف مزاحمت کی کوئی گنجائش نہیں بچتی، قانون اور اخلاقیات جیسے آدرش بھی اس میں جگہ نہیں پاتے، اگر کچھ بچتا ہے تو محض طاقتور کی اطاعت کا طریقہ بچتا ہے۔ یہ مذہب کی بالکل ایک میکانکی تعبیر ہے جس میں حالات، واقعات اور تاریخ کو صرف فاسق اور جابر کے نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے، اِس میکانکی تعبیر میں اخلاقی اور قانونی جواز تلاش کرنے کی بکھیڑے میں نہیں پڑا جاتا۔ صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی یہ تعبیر درست نہیں۔ غامدی صاحب ایک بلند پایہ سکالر ہیں اور ہمیشہ دلیل سے بات کرتے ہیں، اُمید ہے کہ وہ اپنے اِس مقدمے کی بھی اسی طرح منطقی پڑتال کریں گے جیسے وہ دیگر دینی موضوعات کی کرتے ہیں، اُن کی اسی خصوصیت کی وجہ ہی سے ہم اُن کے گرویدہ ہیں۔

اِس قسم کے معاملات ایک اعتراض اکثر کیا جاتا ہے کہ آپ عالم دین نہیں لہٰذا دینی معاملات پر آپ کی رائے کو صائب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایسے لوگوں کی تسلی کے لیے میں دو جید علمائے کرام کی گفتگو پیش کر رہا ہوں، ملاحظہ فرمائیں: ”مُلّا نے سب سے پہلے، ہمارے فقہا نے متغلب کی حکومت کو جائز قرار دیا یعنی اگر کوئی شخص اپنی قوت کے بل پر آ کر حکومت پر قبضہ کر لے تو جائز ہے۔ اور حکمران کے خلاف کوئی بغاوت نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ تمہیں کفر کا حکم نہ دے۔ کفر کا کاہے کو حکم دے گا وہ؟ وہ اپنے عیش منائے گا، اپنے محل بنائے گا، اپنی رنگ رلیاں کرے گا، (اسے) آپ کو کفر کا حکم دینے کی ضرورت کیا ہے؟ یہ تصور ہے جو اسلام کے اندر، اُس کی رگوں میں بھرا گیا اور اُس نے گُھن کر دیا اسلام کو۔۔۔!“ یہ ڈاکٹر اسرار احمد کے ایک خطبے کا اقتباس ہے، میں نے اسے بوجوہ کانٹ چھانٹ کر پیش کیا ہے ورنہ انہوں نے اپنے اس خطبے میں خاصی سخت باتیں کی تھیں جو میں یہاں نہیں لکھ سکتا۔ اسی طرح کی گفتگو مولانا اسحاق مدنی نے بھی ایک موقع پر کی تھی، ذرا اس کی جھلک دیکھیں: ”مسلمان طاغوتوں کے سامنے سر جھکانے کے لیے پیدا نہیں ہوا کہ ظالم تختوں پر بیٹھ جائیں (اور) ہم صرف سر جھکاتے رہیں اور اس پر بھی میں پڑھوں گا کہ جب سے یہ نظریہ ایجاد کیا ہے کہ متغلب جب تخت پر بیٹھ جائے بس نظریہ ضرورت کے تحت اس کو تسلیم کرو، میں اللہ کو حاضر ناظر کر کے کہتا ہوں کہ سارے دین کی بربادی اس لیے ہوئی کہ جس چیز سے یہ ڈرے ہوئے تھے نا کہ اگر مقابلے میں اٹھے تو خون ریزی ہوگی (بعد میں) اس سے زیادہ برائیاں (ہوئیں)۔۔۔!“ میں نے یہ بیان بھی سنسر کر کے پیش کیا ہے کہ مولانا کے الفاظ من و عن نقل کرنے کی مجھ میں سکت نہیں۔ قارئین یا غامدی صاحب کے پیروکاروں میں سے اگر کسی کو میری کوئی بات بری لگی ہو تو پیشگی معذرت۔ ❀❀❀

پاکستان میں دوسری سہ ماہی میں

۹۰ لاکھ سے زائد ویڈیوز ہٹائی گئیں، ٹک ٹاک

سوشل میڈیا ایپلی کیشن ٹک ٹاک کا کہنا ہے کہ پاکستان رواں سال کی دوسری سہ ماہی میں کمیونٹی ہدایات کی خلاف ورزی کے باعث ہٹائی جانے والی ویڈیوز کے حجم کے لحاظ سے دنیا میں دوسرے نمبر پر رہا اور یہاں سے ۹۸ لاکھ ۵۱ ہزار ۷۰۴ ویڈیوز ہٹائی گئیں۔ اپنے بیان میں چینی ایپ نے 'کمیونٹی گائیڈ لائنز انفورسمنٹ' رپورٹ کے نتائج شیئر کیے، جس میں ۲۰۲۱ کی دوسری سہ ماہی میں پلیٹ فارم سے ہٹائے جانے والے مواد کے حجم اور نوعیت کی تفصیلات شامل ہیں۔ بیان میں کہا گیا کہ رپورٹ میں کمیونٹی کی سخت رہنما ہدایات کی خلاف ورزی، کمیونٹی، پالیسی سازوں اور غیر سرکاری تنظیموں کے لیے پلیٹ فارم کے عوامی احتساب کو تقویت دینے کے لیے ہٹائے گئے مواد کے بارے میں تفصیلات فراہم کی گئی ہے۔ ٹک ٹاک انتظامیہ نے کہا کہ اپریل سے جون تک عالمی سطح پر ۸ کروڑ ۱۵ لاکھ ۱۸ ہزار سے زائد ویڈیوز ہٹائی گئیں، جو اپ لوڈ کیے گئے تمام مواد کے ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ ان ویڈیوز میں سے ۹۳ فیصد کے خلاف پوسٹ کیے جانے کے ۲۴ گھنٹے کے اندر جبکہ ۹۴ء۱ فیصد کے خلاف صارف کی جانب سے رپورٹ کیے جانے سے قبل ایکشن لیا گیا۔ کمپنی کا کہنا تھا کہ ہٹائے گئے مواد میں سے ۸۷ء۵ کو کسی صارف نے نہیں دیکھا تھا۔ بیان میں کہا گیا کہ ہٹائے جانے والی ویڈیوز میں سے ۷۳ء۳ فیصد ہراسانی اور دھمکانے جیسے مواد کو فروغ دینے جبکہ ۷۲ء۹ فیصد نفرت آمیز رویے پر مشتمل تھیں جنہیں رپورٹ کیے جانے سے قبل ہٹایا گیا، یہ تعداد رواں سال کی پہلی سہ ماہی میں ۶۶ء۲ فیصد اور ۶۷ فیصد تھی۔ ٹک ٹاک نے کہا کہ یہ بہتری ٹیکنالوجی اور مواد کی اعتدال پسندی کے امتزاج سے آئی ہے جس کی نگرانی مخصوص تفتیشی ٹیم کرتی ہے اور یہ ٹیم پالیسیوں کی خلاف ورزی کرنے والی ویڈیوز کی نشاندہی کرتی ہے۔ ان پالیسیوں کو بہتر طور پر نافذ کرنے کے لیے اڈریٹرز باقاعدہ تربیت بھی حاصل کرتے ہیں تا کہ وہ مواد کی شناخت کریں جس میں کمیونٹی کی ہدایات کی خلاف ورزی کی گئی ہو۔ واضح رہے کہ ویڈیو شیئرنگ پلیٹ فارم پر پاکستان میں متعدد بار پابندی لگائی گئی ہے اور یہ پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) کی جانب سے اب بھی بلاک ہے۔ پاکستان میں ایپ پر پہلی بار پابندی اکتوبر ۲۰۲۰ میں لگائی گئی تھی اور پی ٹی اے کا کہنا تھا کہ یہ فیصلہ ایپ پر فحش و غیر اخلاقی مواد کی شکایات کے بعد لیا گیا۔ بعد ازاں ٹک ٹاک انتظامیہ نے لاکھوں نامناسب مواد پر مبنی ویڈیوز ہٹانے کا دعویٰ کیا تھا جس کے بعد پی ٹی اے نے ٹک ٹاک کی سروس بحال کی تھی۔ رواں برس مارچ میں پشاور ہائی کورٹ نے بھی غیر اخلاقی مواد کی موجودگی کے باعث ٹک ٹاک کو بند کرنے کا حکم دیا تھا۔ بعد ازاں ٹک ٹاک انتظامیہ کی جانب سے فحش ویڈیوز ہٹائے جانے کے دعوے اور یقین دہانی پر اپریل میں اس کی سروس بحال کر دی گئی تھی۔ قبل ازیں جون میں سندھ ہائی کورٹ نے ایک شہری کی درخواست پر ٹک ٹاک پر پابندی عائد کی تھی جس کے خلاف پی ٹی اے نے متفرق درخواست دائر کی تھی۔ بعد ازاں ہائی کورٹ نے پی ٹی اے کو ٹک ٹاک سے متعلق درخواستیں جلد نمٹانے کا حکم دیتے ہوئے ٹک ٹاک پر عائد کی گئی پابندی کا فیصلہ واپس لے لیا تھا۔ جولائی میں پی ٹی اے نے 'نامناسب مواد' ہٹائے جانے میں ناکامی پر ٹک ٹاک تک رسائی ایک بار پھر بلاک کر دی تھی۔ ❀❀❀

شعبہ پاکستان

انصاف کس قدر ضروری ہے؟

تحریر: مظہر برلاس

حضرت علیؓ فرماتے ہیں ”انصاف کرو ورنہ یادر کھنا کہ حضرت صالحؑ کی اونٹنی کے قاتل صرف چار تھے مگر پوری قوم غرق ہوگئی کیونکہ باقیوں کا جرم صرف خاموش رہنا تھا“۔

خدائے لم یزل کا شکر گزار ہوں کہ کبھی ناانصافیوں پر چپ نہیں رہا، کسی نہ کسی صورت احتجاج ضرور کیا ہے، ہر ناانصافی پر صدائے احتجاج ضرور بلند کی ہے، خواہ یہ ناانصافی، انصاف فراہم کرنے والوں ہی کی جانب سے کیوں نہ ہو۔ آپ کو یاد ہوگا جب سپریم کورٹ کے ایک چیف جسٹس کے صاحبزادے کے ”لچھن“ سامنے آئے تو یہ صفحات گواہ ہیں کہ میری طرف سے خاموشی کا مظاہرہ نہیں ہوا تھا بلکہ برملا اقرار کرتا ہوں کہ میری زندگی میں اگر کوئی کاش ہے تو بس یہی کہ میں ایک ایسی تحریک کا حصہ بنا جو انصاف کے لئے تھی۔

برادر بزرگ چودھری اعتزاز احسن اس تحریک میں بڑے سرگرم تھے، ہم نے ڈنڈے کھا لئے مگر وہ شخص جب بحال ہوا تو اس نے پوری قوم کو مایوس کیا، وہ صاحب بال لہرا کے تقریریں کرتے تھے بعد ازاں انہیں بھی افسوس کے آنگن میں بیٹھنا پڑا۔ پچھلے دنوں پروٹوکول کی محتاجی میں رہنے والے اس چیف جسٹس کے ایک رشتے دار کو لوگوں نے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا کیونکہ انہوں نے دولت کی ہوس میں لوگوں کے ساتھ دھوکہ کیا، ظلم کیا، ناانصافی کی، یہاں سب فرعونی لہجے خاک کا رزق بن جاتے ہیں مگر لوگ سوچتے نہیں۔

افتخار چودھری نے پاکستان کے عدالتی سربراہ کے طور پر اتنی غلط روایات قائم کیں کہ اس کے بعد ابھی تک عدالتوں کا ماحول سدھر نہیں سکا۔ آئے روز عدالتوں میں مار دھاڑ کے واقعات سامنے آتے ہیں، ہمارے وکلاء بھائی ماتحت عدالتوں کو تالے بھی لگا دیتے ہیں، بعض تو ماتحت عدالتوں کے ججوں کی توہین ہی کر ڈالتے ہیں مگر انصاف کے نظام میں یہ عجیب انصاف ہے کہ سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے ججوں کے سلسلے میں توہینِ عدالت کا قانون جاگ جاتا ہے مگر ماتحت عدالتوں کے ججوں کے ساتھ جو مرضی ہو جائے۔

توہینِ عدالت ہوتی ہی نہیں سو ان ججوں کو مخالف فریق کے ساتھ مجبوراً صلح صفائی کرنا پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ انصاف کے تقاضوں کے مطابق نہیں۔ پچھلے چند برسوں میں عدالتوں کے علاوہ اسپتالوں اور دیگر اداروں پر بھی حملے نظر آئے، یہ سب کچھ قانون کے ٹھیکیداروں نے کیا۔ تنخواہوں کے معاملے میں بھی ناانصافی اور ظلم ہے، ایک ہی ملک میں تنخواہوں میں اتنا بڑا تضاد کیوں ہے؟ ججز تو ججز رہے، عدالتوں میں کام کرنے والے دوسرے ملازمین کی تنخواہیں بھی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، عام ججوں کی تنخواہیں وزیراعظم، صدر اور آرمی چیف سے زیادہ ہیں۔ عجیب ظلم ہے کہ ایک عام سرکاری ڈرائیور تیس چالیس ہزار تنخواہ لیتا ہے مگر اسی طرح کا ڈرائیور جب ہائیکورٹ یا سپریم کورٹ میں ہو تو اس کی تنخواہ لاکھوں میں ہوتی ہے۔

ہر ضلع میں انتظامی افسر گریڈ ۱۸ کا ہے مگر وہاں پر عدالتی افسر گریڈ ۲۲ کا ہے، یہ گریڈ شاید صوبے کے چیف سیکرٹری کا ہو کیونکہ بعض جگہوں پر چیف سیکرٹری بھی گریڈ ۲۱ کے ہیں۔

تنخواہوں، پروٹوکول اور گریڈوں میں انصاف کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہئے، اعلیٰ عدالتوں میں تو اور بھی عجیب بات ہے، محض چند سالہ نوکری، بھاری تنخواہیں، اعلیٰ پروٹوکول اور عمر بھر کا سکھ چین۔ اس دوران انتظامی اختیارات کا بھی کسی اور طریقے سے استعمال، یہ نوکری تو واقعی امرت دھارا ہے۔ کچھ برس پہلے لاہور ہائیکورٹ کے ایک چیف جسٹس نے جب لوئر جوڈیشری کے امتحانات کو پی سی ایس سے نکال کر ڈائریکٹ اپنے ماتحت کیا تھا تو جنگ کے انہی صفحات میں اس خاکسار نے اس کی بھرپور مخالفت کی تھی کیونکہ اس امتحانی چکر کے پیچھے مالی مفادات کا وسیع کھیل تھا۔ تحریری امتحان کے بعد انٹرویوز میں بھی ایک کہانی تھی، انصاف ہوتا تو لوگ عدالتوں میں دھکے کھا رہے ہوتے؟ پھر ایک اور چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ آئے انہوں نے بچوں کی شادیوں کے لئے کیا کچھ نہ کیا، ان کی سیاسی تصویریں سوشل میڈیا کا حصہ بن گئیں۔ لاہور ہائیکورٹ کے موجودہ چیف جسٹس محمد امیر بھٹی سے لوگوں کی بہت توقعات وابستہ ہیں۔ لوگوں کو امید ہے کہ جن مقدمات کے فیصلے آج تک لٹکائے جاتے رہے، اب وہ فیصلے ہو جائیں گے۔ خاص طور پر سانحہ ماڈل ٹاؤن کا بڑا ذکر ہو رہا ہے کہ اب اس اہم مقدمے کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔

یہ سب ٹھیک ہے مگر اس دوران پورے پنجاب کی ماتحت عدالتوں میں خوف کے سائے منڈلانے لگے ہیں۔ میرے صوبے پنجاب کو پتہ نہیں کس کی نظر لگ گئی ہے کہ یہاں پہلے انتظامی افسر ٹرانسفر کے خوف کا شکار تھے اب عدالتی افسر بھی اس کا شکار ہو گئے ہیں، پنجاب کی ماتحت عدالتوں کے ججوں کو ہر وقت یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ پتہ نہیں کل ٹرانسفر کہاں کر دیا جائے۔ خوف کے یہ سائے پھیلانے میں سارا کردار لاہور ہائیکورٹ کے ہی ایک آفس کا ہے جہاں چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ کے ہی ماتحت کچھ افراد اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ انہوں نے جسٹس محمد امیر بھٹی کی تمام تر کوششوں پر پانی پھیرنا ہے۔ ان افراد کی انتقامی پالیسیوں کے تحت بعض خواتین ججوں کے تبادلے بھی گھر سے پانچ سو کلومیٹر دور ہو رہے ہیں۔ چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ کو چاہئے کہ وہ انتظامی امور چلانے کے لئے ایڈمنسٹریشن کمیٹی سے مشورہ لیں اور ان افراد کو، جو بدنامی کا باعث بن رہے ہیں، خود سے دور کریں تاکہ جسٹس محمد امیر بھٹی کا نام اچھے لفظوں کے ساتھ تاریخ کا حصہ بنے ورنہ سرور ارمان تو پہلے ہی کہہ رہے ہیں کہ

عدل کے معیار میں آجائیں گی تبدیلیاں
بے گناہی لائق تعزیر کر دی جائے گی

❁❁❁

توشہ خانے کے قومی راز

تحریر: رؤف کلاسرا

انسان کی سب سے بڑی کمزوریوں میں سے ایک ترغیب (Temptation) سمجھی جاتی ہے۔ آپ کی بہادری یا ایمانداری کا اس دن ٹیسٹ ہوتا ہے جب کسی ترغیب کا سامنا کرنا پڑے۔ ترغیب کسی چیز کی بھی ہوسکتی ہے اور ہمیشہ ایسی چیز ہوتی ہے جو لانگ ٹرم میں آپ کیلئے مشکلات لانے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ ہم روز نہیں تو اکثر اس کا سامنا کرتے رہتے ہیں اور مجھے نہیں پتہ ہم میں سے کتنے کامیاب ہوتے ہوں گے جو کسی ترغیب کے جال میں نہ پھنسیں۔ آپ نے بھی ایسی فلمیں دیکھی ہوں گی جن میں اکثر دکھاجاتا ہے کہ ایماندار افسر کے گھر علاقے کا ڈان جب بھی جائے گا' ایک بریف کیس میں نوٹ بھر کر لے جائے گا۔

میں اکثر سوچتا تھا کہ ڈان اس افسر کو اس رقم کے برابر ایک چیک دینے کے بجائے بریف کیس میں کیش کیوں دے رہا ہوتا ہے؟ جو کام محض کاغذ کے ایک ٹکڑے سے ہوسکتا ہے اس کے لیے اتنی تکلیف کی کیا ضرورت ہے کہ پورا بریف کیس نوٹوں سے بھر لو اور کسی کے سامنے کھول کر بیٹھ جاؤ۔ خیر بڑے عرصے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ سب کام ترغیب کا ہے اور جو ترغیب نقد نوٹوں کی گڈیاں دے سکتی ہیں وہ ایک چیک نہیں کرسکتا۔ چیک سامنے پڑا ہوتو اسے اٹھا کر پھینکا جاسکتا ہے' لیکن اگر پورا بریف کیس نوٹوں سے بھرا ہو تو ایک لمحے کیلئے تو بڑے سے بڑا نیک انسان ڈگمگا جائے گا۔ یہی انسانی فلاسفی اور نفسیات ہے کہ انسان ایک ارب روپے کے بینک چیک کے سامنے ایماندار اور ٹھہر جائے گا لیکن بریف کیس میں ایک کروڑ روپے کو دیکھ کر سوچوں میں پڑ جائے گا۔ یہی کچھ ہمارے حکمرانوں کے ساتھ ہوا' جو ایمانداری کے ڈھول پیٹتے تھے اور جن کیلئے پیسہ اور دنیاوی اشیا کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ جنہیں خدا نے ملک کا بادشاہ بنایا وہ اس وقت اوندھے منہ گر پڑے جب ان کے سامنے بریف کیس کے منہ کھولے گئے اور جب انہوں نے اپنے سامنے ہیرے جواہرات، سونے کے زیورات، رولیکس گھڑیاں، نیکلس، بریسلیٹس، جیولری باکس کے ڈھیر لگے دیکھے۔ اب آپ کا یہ امتحان تھا۔ آپ کی نیکی ایمانداری کا۔ لیکن کیا ہوا؟

آپ بیرون ملک دورے پر تھے اور ان ملکوں کے سربراہان نے روایت کے طور پر تحائف دیے۔ تحائف بھی وہ جن کی مالیت کروڑوں میں تھی۔ اب یہ اصول صدیوں سے چلا آرہا ہے کہ تحائف کسی بندے کو نہیں ملتے بلکہ ریاست یا اس عہدے کو ملتے ہیں جس پر وہ براجمان ہوتا ہے' اس لیے امریکہ جیسے ملکوں میں بھی تحائف وہاں کے توشہ خانے میں جمع کرادیے جاتے ہیں اگر وہ مہنگے ہوں۔ ہاں اگر معمولی نوعیت کے ہوں تو پھر وہ گھر لے جاسکتے ہیں۔ اب اگر حکمران پاکستانی ہو تو وہ بھلا کیسے قیمتی تحفے اٹھا کر توشہ خانے میں جمع کرا دے کہ یہ قوم کا خزانہ ہے قوم کے پاس رہے۔ لہٰذا ان حکمرانوں اور بیوروکریٹس نے مل کر چپکے سے اپنے لیے ایک الگ قانون بنالیا کہ جو تحفہ ملے گا واپسی پر پاکستانی بازار سے اس کی قیمت کا اندازہ لگوایا جائے گا اور جو بھی کل لاگت ہوگی اس کا دس فیصد ادا کر کے وہ حکمران یا بیوروکریٹ یا دیگر لے جاسکتے ہیں۔ اگر تحفہ ایک کروڑ روپے کا ہے تو آپ دس لاکھ روپے ادا کر کے نوے لاکھ روپے کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اب ہوتا یہ ہے کہ افسران حکمرانوں اور سرکاری افسران کو اس لوٹ مار میں زیادہ سے زیادہ فائدہ دینے اور خوشامد کے لیے ان قیمتی تحائف کی پاکستانی بازار سے قیمت کم سے کم لگواتے ہیں تاکہ انہیں اس کا دس فیصد بھی کم دینا پڑے۔ ان تحائف کی مقامی بازار سے لاگت کیسے کرائی جاتی ہے کا اندازہ اس سے لگالیں کہ شوکت عزیز نیپال گئے تو گورنر نیپال نے ان کی بیگم صاحبہ کو دو ریشمی سکارف تحفے میں دیے۔ واپسی پر ان سکارفس کی قیمت صرف پچاس روپے لگائی گئی مطلب پچیس روپے فی سکارف۔ اسی طرح برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر پاکستان کے دورے پر آئے تو شوکت عزیز کیلئے تحفہ لائے جس کی قیمت یہاں صرف دو ہزار روپے لگا کر تحفہ شوکت عزیز کو تھما دیا گیا' شہزادہ چارلس پاکستان آئے تو اپنے ساتھ ایک لیڈی بیگ لائے جو بیگم شوکت عزیز کو تحفہ کے طور پر دیا۔ اس کی قیمت افسران نے صرف تین سو روپے لگوائی اور بیگم صاحبہ کو تھما دیا گیا۔

حکمرانوں کو کیا کچھ ملتا ہے اس کی ایک جھلک اس سے ملے گی کہ بیگم پرویز مشرف کو سعودی عرب کے دورے میں ایک جیولری باکس ملا۔ کھولا گیا تو اس میں سے نیکلس، ڈائمنڈ سیٹ، بریسلیٹ، گولڈ سیٹ، اور دیگر اشیا نکلیں۔ وطن واپسی پر اس جیولری باکس کی قیمت کم کراتے کراتے بھی ستر لاکھ روپے لگائی گئی۔ جنہوں نے شوکت عزیز کے تحائف کی قیمتیں دو ہزار روپے، تین سو روپے یا پچیس روپے فی سکارف لگوائی تھیں وہی اس جیولری باکس کی لاگت لگوا رہے تھے' لیکن اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود لاگت ستر لاکھ تک لا سکے۔ دس فیصد ادائیگی کی گئی اور جیولری باکس صہبا مشرف گھر لے گئیں۔ اب ذہن میں رکھیں کہ ایسے جیولری باکس یا قیمتی تحائف ہر دفعہ پاکستان کا جو بھی وزیراعظم یا صدر عمرہ کرنے جاتا ہے اس کی بیگم صاحبہ کو میزبان پیش کرتے ہیں۔ ان تحائف میں اتنی گڑبڑ کی گئی کہ اس وقت گیلانی، زرداری اور نواز شریف نیب میں توشہ خانہ ریفرنس کا سامنا

کر رہے ہیں۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ ان تحائف کی تفصیل اگر قومی اسمبلی یا سینیٹ مانگ لیتی تھی تو کابینہ ڈویژن وہ سب تفصیلات پارلیمنٹ میں پیش کرتا تھا‘ لیکن نواز شریف جب تیسری دفعہ وزیر اعظم بنے تو انہوں نے دنیا کے ایک سو سے زائد ملکوں کا دورہ کیا اور انہیں بڑی تعداد میں تحائف بھی ملے۔ ایک دن سینیٹر کلثوم پروین نے سینیٹ میں سوال اٹھا دیا کہ نواز شریف دور کے تین سالوں میں بیرونی ممالک سے ملنے والے تحائف کی تفصیلات فراہم کی جائیں۔ اس پر وزیر اعظم ہاؤس اور کابینہ ڈویژن میں تھرتھلی مچ گئی کہ اب کیا کریں۔ سرکاری بابوز حکمرانوں کی کرپشن چھپانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ فوراً پرویز مشرف دور کے انفارمیشن آرڈیننس ۲۰۰۲ کا حوالہ دیا گیا‘ جس کے تحت ان تحائف کو قومی راز ڈکلیئر کر دیا گیا اور کہا گیا کہ اگر تحائف کی فہرست دی گئی یا ملک کے نام کا پتہ چلا کہ کس نے دیا ہے تو ریاستوں کے تعلقات خراب ہوں گے۔ اندازہ کریں جو جیولری باکس، ہیرے جواہرات، نیکلس، رولیکس گھڑیاں، ڈالروں میں نقدیاں، بریسلیٹ تحائف کے نام پر گھر لے جا رہے تھے اچانک انہیں پتہ چلا کہ یہ تو قومی راز ہیں۔ سب کا خیال تھا کہ عمران خان مختلف ثابت ہوں گے لیکن اب جب ان سے پوچھا گیا کہ انہیں اور خاتون اول کو بیرونی ملکوں سے کیا کیا تحائف ملے ہیں تو بالکل وہی جواب دیا گیا جو نواز شریف حکومت نے کلثوم پروین کو دیا تھا کہ یہ قومی راز ہیں۔ ان قومی رازوں میں سے ایک راز یہ بھی ہے چھوڑیں شوکت عزیز کو ملنے والے کروڑوں روپے کے باقی ۱۱۲۶ تحائف کو جو وہ اونے پونے لے گئے، صرف بیگم رخسانہ عزیز بارہ نیکلس اپنے گھر لے گئی تھیں۔

اب آپ کو اندازہ ہو رہا ہے کہ جناب وزیر اعظم بیرونی دوروں میں ملنے والے تحائف کو کیوں قومی راز ڈکلیئر کیے بیٹھے ہیں؟

❁❁❁

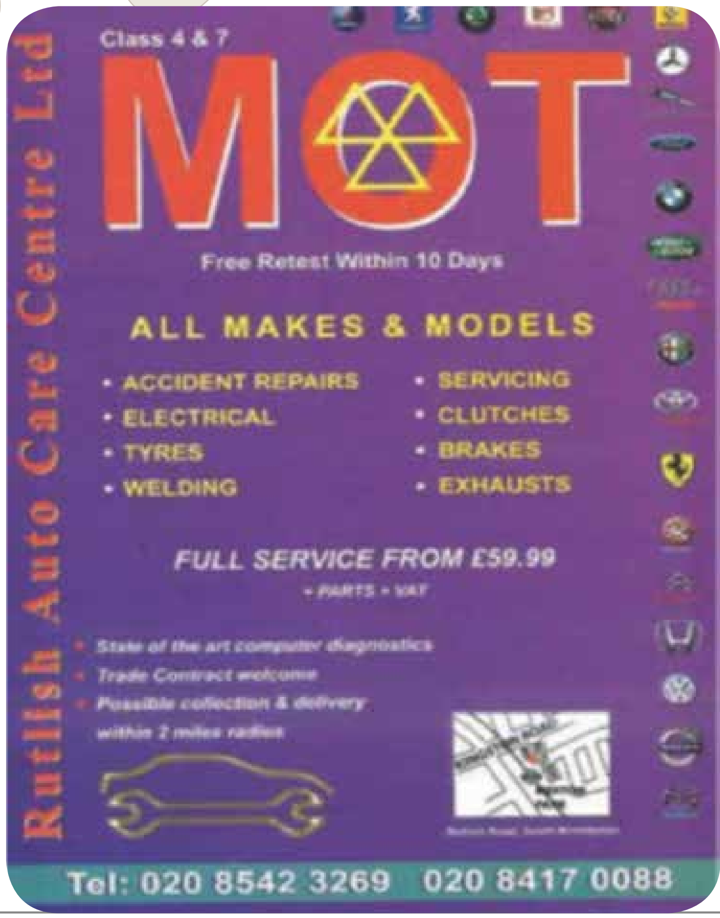

مذہبی شدت پسندی کی ایک مثال

تحریر: خرم منور

سن دو ہزار گیارہ میں اسلام آباد میں ایک جاب کے لیئے انٹرویو دینے گیا تو انٹرویو لینے والے نے رسمی سلام دعا کے بعد مجھ سے پوچھا کہ میں کس مذہب سے تعلق رکھتا ہوں۔ جاب چونکہ آؤٹ باؤنڈ کال سینٹر کی تھی تو میں نے اُس سے پوچھا کہ جاب کا اس بات سے کیا تعلق ھے کہ میرا مذہب کیا ھے؟ انٹرویو لینے والے نے فرمایا کہ مذہب کے بارے میں بتانا ضروری ھے... میں نے کہا میرا مذہب اسلام ھے۔ پھر اُس نے پوچھا سُنی ہیں یا شیعہ؟ تو میں نے بتایا کہ سُنی ہوں۔ اُس نے فخر سے بتایا کہ میں بھی سُنی ہوں... لیکن اُس وقت تک میرا دماغ خراب ہو چُکا تھا۔

چونکہ UK میں چھ سال گزارنے کے بعد پاکستان گیا تھا تو پاکستان میں کہیں انسانیت نظر ہی نہیں آرہی تھی اور حالات کی وجہ سے پہلے ہی دماغ خاصا خراب تھا۔ میں نے اُسے پوچھا کہ اگر میں شیعہ ہوتا تو کیا یہ جاب میرے لیئے نہ ہوتی۔ اُس نے کہا کہ ایسی بات نہیں ھے ہم صرف قادیانیوں کو نوکری نہیں دیتے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اگر کوئی قادیانی مجھ سے زیادہ بہتر انگریزی جانتا ہو اور مجھ سے زیادہ تجربہ رکھتا ہو تو کیا پھر بھی یہ نوکری آپ اُسے نہیں دیں گے۔ اُس نے کہا نہیں۔ میں نے پوچھا گر اُس کو اس نوکری کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہو تو کیا پھر بھی یہ نوکری آپ اُسے نہیں دیں گے... اُس نے کہا کہ ہم قادیانیوں کو کسی بھی صورت نوکری نہیں دیتے۔ دل تو کر رہا تھا کہ میں اس شخص کا بُرا کر دوں۔ اس کا سارا اسلام ایک جھٹکے میں اس کے ہاتھ پر رکھ دوں۔ لیکن صرف اتنا ہی کہہ پایا کہ

I am not sorry to say that you dont deserve me and this place is not for me.

آج اس بات کو دس سال ہو گئے ہیں۔ مجھے فخر ھے کہ میں نے اُس نوکری پر لعنت بھیجی تھی حالانکہ اُس وقت مجھے نوکری کی شدید ضرورت بھی تھی۔ آج بھی مذہبی شدت پسندی پاکستان میں اُسی طرح پنپ رہی ہے۔ کل عامر لیاقت کا ہندو برادری کی توہین آمیز ٹویٹ کرنا اور حکومت کا اس پر کوئی ایکشن نہ لینا اس بات کا ثبوت ھے پاکستان مذہبی شدت پسندی کی سب سے بڑی یونیورسٹی بن چُکا ھے۔ ہم نے بچوں تک میں نفرتیں ہی نفرتیں بھر دی ہیں۔ پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ اور اس کے علاوہ نوکریوں کے فارموں کے علاوہ ہسپتال میں مریض کے کوائف تک میں مذہب کا پوچھا جانا اس بات کا ثبوت ھے کہ مذہب اب انسان اور خدا کا آپس کا معاملہ نہیں رہ گیا۔ میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیشہ کی طرح مذہب ہی ایک اور عظیم انسانی جنگ کی وجہ بنے گا۔ اگر ہم واقعی دُنیا کو رہنے کے قابل بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں مذہب کو صرف اپنے تک محدود کرنا ہو گا اور دوسروں کے مذہبی عقائد سے اختلاف کو بنیاد بنا کر مذہبی امتیاز سے دور رہنا ہو گا۔

❁❁❁

چولبے چولبے سنگرام چولبے

تحریر: ڈاکٹر توصیف احمد خان

پاکستان ہندوستان کے بٹوارے کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ ہندوستان کے صوبے بہار سے بھاری تعداد میں افراد ہجرت کر کے مشرقی پاکستان (مشرقی بنگال) میں آباد ہوئے۔ حسان الحق بہار کے گاؤں بہراواں میں پیدا ہوئے۔ وہ والدین کے ساتھ ہجرت کر کے ڈھاکا کے محلے محمد پور میں آباد ہوئے۔

ان کے بچپن کے دوست عقیل احمد کہتے ہیں کہ سنگرامی نے کبھی رسمی تعلیم حاصل نہیں کی، انھوں نے اپنی محنت سے اردو اور انگریزی سیکھی اور اسی طرح فوٹو گرافی پر دسترس حاصل کی۔ انھیں سابقہ مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکا سے شائع ہونے والے ایک اردو روزنامہ پاسبان میں فوٹو گرافر کی ملازمت مل گئی۔ ۱۹۶۰ میں مشرقی پاکستان میں اخبارات کی صنعت کادارومدار سرکاری اشتہارات پر ہوتا تھا۔ مجموعی طور پر اردو اخبارات کی معیشت کمزور تھی۔ اردو اخبارات کے پڑھنے والوں کی تعداد کم تھی، یوں ان اخبارات میں مستقل معاشی بحران رہتا تھا۔ روزنامہ پاسبان میں صحافیوں کی اکثریت پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس سے منسلک تھی۔ معروف صحافی علی احمد خان نے کراچی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور بائیں بازو کی طلبہ تنظیم نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن NSF سے منسلک رہے۔ جب صحافت کا پیشہ اختیار کیا تو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس میں فعال ہوئے، وہ مشرقی پاکستان میں کام کرنے والے کمیونسٹ پارٹی سے رابطہ میں تھے اور کمیونسٹ پارٹی کے ہمدردوں میں شامل تھے۔

انھوں نے روزنامہ پاسبان میں یونین قائم کی۔ انھوں نے اپنی یادداشتوں کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ حسان الحق کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ وہ انتظامیہ کے آدمی ہیں۔ پاسبان میں یونین کا ایک اہم اجلاس ہوا۔ علی احمد خان کہتے ہیں کہ اس اجلاس میں اچانک حسان آگئے تو تقریباً تمام شرکاء نے اچانک خاموشی اختیار کرلی۔ سب کا خیال تھا کہ حسان کو اجلاس میں شرکت کی اجازت نہیں ہونی چاہیے مگر انھوں نے کہا کہ حسان تشریف رکھیں اور اجلاس جاری رکھا جائے۔ یونین کے اس اجلاس نے حسان کی زندگی تبدیل کردی۔ وہ ساری زندگی کے لیے ٹریڈ یونین کے اسیر ہوئے اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس سے منسلک ہوئے۔

جب پی ایف یو جے کے رہنما منہاج برنا کو ایوب خان کی حکومت نے زبردستی ڈھاکا بھیجا تو سنگرامی وہاں ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے۔ حسان ڈھاکا یونین آف جرنلسٹس اور پی ایف یو جے کے جلسوں میں جوش و خروش سے نعرے لگانے کی وجہ سے مشہور ہوئے، وہ ۱۹۷۰ میں کراچی آئے اور روزنامہ حریت میں ملازمت کرلی۔ پی ایف یو جے نے ۱۹۷۰ میں غیر صحافتی عملہ کو عبوری امداد دینے کے حق میں ۱۱ دن تک تاریخی ہڑتال کی، اس دوران پاکستان کے دونوں حصوں سے کوئی اخبار شایع نہ ہوا۔ حسان کو بنگالی زبان جاننے والے صحافیوں نے سنگرامی کا لقب دیا جو ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ ۱۹۷۱ میں سنگرامی ڈھاکا میں تھے کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ کو مشرقی پاکستان دنیا کے نقشہ سے غائب ہوا اور بنگلہ دیش دنیا کے نقشہ پر طلوع ہوا۔ بنگالی تو ترقی کی راہ پر لگ گئے مگر وہاں مقیم اردو بولنے والی آبادی کی زندگی اجیرن ہوگئی۔

حسان سنگرامی بھارت سے ہوتے ہوئے نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو پہنچ گئے، وہ اور سیکڑوں افراد پاکستان کے سفارت خانے سے پاسپورٹ اور مدد کے طالب تھے، سنگرامی پاکستانی سفارت خانے کے چکر لگاتے اور احتجاج کرتے ہوئے مایوس ہوئے تو بھارت واپس گئے۔ ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے بھارت کی ریاست راجھستان سے تھر کے ریگستان سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

اس زمانہ میں عالمی شہرت یافتہ ادیب شوکت صدیقی پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبار روزنامہ مساوات کے مدیر تھے۔ سنگرامی روزنامہ مساوات میں فوٹو گرافر بن گئے۔ سنگرامی اور ان کے خاندان نے کسمپرسی میں نئی زندگی کا آغاز کیا، اورنگی میں کچا مکان بنایا، کچھ عرصہ بعد سنگرامی نے شادی کی۔ ان کی اہلیہ جو ایک معلمہ ہیں ساری زندگی محنت کرنے پر یقین رکھتی ہیں انھوں نے ہر مشکل دور میں سنگرامی کا ساتھ دیا، سنگرامی مشکل حالات میں بھی صحافیوں کی ٹریڈ یونین سے منسلک رہے۔

۱۹۷۸ میں پی ایف یو جے نے جنرل ضیاء الحق کی بعض اخبارات پر پابندیوں کے خلاف رضا کارانہ گرفتاریاں دینے کی تحریک شروع کی سنگرامی گرفتاریاں دینے والے پہلے دستے میں شامل تھے۔ پی ایف یو جے کے سینئر رہنما اور معروف صحافی غلام نبی مغل کا کہنا ہے کہ جیل میں سنگرامی جتنے خوش اور مطمئن تھے دوسرا کوئی فرد نہ تھا۔ وہ مختصر کپڑے پہن کر جیل میں مٹر گشت کرتے۔ مغل صاحب نے انھیں سمجھایا کہ ملاقات کے لیے آنے والے سارے عزیز سمجھتے ہیں کہ جیل والوں نے کپڑے چھین لیے ہیں، یوں ان کا رویہ تبدیل ہوا۔

سنگرامی نے طویل عرصہ بے روزگاری گزاری، وہ مختلف اخبارات کے لیے کام کرتے رہے۔ کئی سال بعد انھیں روزنامہ ڈان میں ملازمت ملی۔ حالاتِ زمانہ انھیں کینیڈا لے گئے جہاں وہ تنہائی کا شکار ہوئے۔ سنگرامی ۸ ہفتے قبل کینیڈا کے شہر ٹورنٹو کے اسپتال میں اوپن ہارٹ سرجری کے لیے داخل ہوئے، پھر گھر چلے گئے۔ گزشتہ ہفتہ انھیں ایمرجنسی میں اسپتال منتقل کیا گیا مگر سنگرامی اپنی زندگی کے ۸۰ سال پورے کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوگئے۔ حسان کے نام کے ساتھ سنگرامی کا لاحقہ بنگالی زبان میں اس نعرہ سے ماخوذ تھا:

چولبے چولبے سنگرام چولبے، چلے گی چلے گی تحریک چلے گی! اے بریر سونگرم سد ھینوتر سونگرم، اس دفعہ کی تحریک، آزادی کی تحریک۔

یہ نعرے ہی دراصل ان کی زندگی کا محور تھے۔

❁❁❁

کیہہ جاناں میں کون بُلھیا!

تحریر: عطاء الحق قاسمی

مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ میرا تعلق بائیں بازو سے ہے یا دائیں بازو سے۔ میرے دائیں بازو کے دوست مجھے بائیں بازو کا سمجھتے ہیں اور بائیں بازو کے دوستوں کے خیال میں میرا تعلق دائیں بازو سے ہے۔ سچ پوچھیں تو خود میں بھی اس معاملے میں کنفیوژ ہوں، مثلاً میں سمجھتا ہوں کہ ریاست کا کام مذہب نافذ کرنا نہیں بلکہ مذہب دراصل خود پر نافذ کرنے کی چیز ہے، وہ بھی اگر آپ خود پر نافذ کرنا چاہتے ہوں، میں اس حوالے سے ممتاز دینی اسکالر جاوید غامدی صاحب کی تحریروں کا ممنونِ احسان ہوں۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ دولت کی مساوی تقسیم تو ممکن نہیں، لیکن امیروں اور غریبوں کے درمیان جو فاصلہ میلوں پر محیط ہے وہ چند فرلانگ سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ میں نے کہا کہ ریاست کا کام مذہب کا نفاذ نہیں۔ اس حوالے سے میرے نزدیک ریاست کا کام ملک میں امن وامان قائم کرنا، انصاف قائم کرنا، لوگوں کے جان ومال اور عزت کی حفاظت کرنا، انہیں کپڑا، مکان اور روٹی فراہم کرنا، ان کی بہترین تعلیم کا انتظام کرنا، جاگیرداری ختم کرکے، شاہ ولی اللہؒ کے مطابق افراد کو صرف اتنی زمین کی اجازت دینا جتنی وہ خود کاشت کرسکتے ہوں۔ شہریوں کو ملازمتیں مذہب کی بنیاد پر نہیں ان کی استعداد کے مطابق ملنی چاہئیں۔ معاشرے میں روا داری اور برداشت پیدا کرنا ہی ریاست کا کام ہے۔ متشدد تنظیموں کا قیام اور انہیں پالنا پوسنا ریاست کے لئے زہر قاتل ہے۔ ملک کا نظام عوام کے منتخب نمائندوں کی ذمہ داری ہے، اس میں کسی بھی آمر خواہ وہ اسلام اور خواہ سوشلزم کے نام پر جمہوریت کو تہہ وبالا کرے یا اس کے بغیر بھی ریاستی امور میں دخل اندازی کرے، ناقابل قبول ہے۔ رقص وموسیقی اگر کسی کمزور دل کے انسان کا اخلاق خراب کرنے کا باعث بنتے ہوں، اسے ان سے دور رہنا چاہئے، البتہ اخلاقی حدود سے تجاوز کرنے والے پروگراموں پر پابندی ضرور لگانا چاہئے۔ مولانا جعفر شاہ کی کتاب ''اسلام اور موسیقی'' میرے خیال کی تصدیق کرتی ہے۔ اسی طرح اختلاف رائے کی بنا پر کسی کو غدار قرار دینا بذات خود غداری کی ایک قسم ہے۔ بغیر ثبوت کے الزام تراشی قابل نفرت فعل ہے، اس کی کڑی سزا نہ صرف مقرر ہونا چاہئے بلکہ اس پر عمل بھی ضروری ہے۔ اور ہاں اس حوالے سے مجھ پر ایک فرد جرم یہ بھی ہے کہ میں بائیں بازو کے ادیبوں اور صحافیوں کے ''چنگل'' میں روز اول سے ہوں۔

یہ اور اس طرح کی بہت سی دوسری باتیں ہیں، جن کی بنا پر دائیں بازو کے دوست ایک بار مجھے ماضی میں بھی اور اب مستقل طور پر سُرخا کہتے چلے آرہے ہیں۔ اور یہ جو میرے بائیں بازو کے دوست ہیں ان میں سے ان لوگوں سے میری نہیں بنتی جو اقبال جیسے دیو قامت شاعر اور مفکر کی شاعری اور افکار میں محض اس لئے کیڑے نکالتے ہیں کہ وہ اسلام کا نام کیوں لیتے ہیں، یہ چھوٹے لوگ ہیں، ورنہ فیض احمد فیض، علی سردار جعفری اور دوسرے نامور ترقی پسند اقبالؒ کو شاید مجھ سے بھی زیادہ جانتے اور مانتے ہیں۔ صرف یہی بزرگ نہیں بلکہ اقبالؒ کے مداحوں میں یورپین اور امریکن دانشور بھی ہیں۔ اقبالؒ اردو کا واحد بین الاقوامی شاعر ہے۔ مغربی دانشوروں نے مولانا روم کو اب مانا ہے تو میرے بائیں بازو کے دوست بھی مولانا کو ماننا شروع ہوگئے ہیں، جبکہ مولانا روم، اقبالؒ کے مرشد ہیں، یار و مولانا کے صدقے اقبالؒ کو بھی مان لو۔ اسی طرح قائد اعظمؒ اور پاکستان میری کمزوری ہیں، مگر ہمارے بعض ترقی پسند دوست آج بھی یہ ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں کہ قائد اعظمؒ نے پاکستان بنا کر (معاذ اللہ) ایک غلطی کی، مگر ان میں سے کوئی ایک دوست بھی پاکستان چھوڑ کر انڈیا جانے کو تیار نہیں۔ مرحومہ فہمیدہ ریاض گئی تھیں، مگر انتہا پسند ہندوؤں نے ان کا جینا حرام کردیا تھا چنانچہ وہ واپس آگئیں۔ اسی طرح میری محبوب رائٹر قراۃ العین حیدر کو اپنے باس کے توہین آمیز رویے کی وجہ سے پاکستان چھوڑنا پڑا مگر وفات تک ان کے دل سے پاکستان کی محبت نہیں گئی۔ میرے بائیں بازو کے کچھ دوست ملّا کی تنگ نظری کی بات کرتے ہیں، مگر بہت سے معاملات میں وہ ملّا سے دو ہاتھ آگے ہیں، یہ جن ادیبوں اور شاعروں کو ترقی پسند سمجھتے ہیں، ان کے حوالے سے ایک مافیا کی صورت سامنے آتے ہیں اور دوسروں کے ادبی مقام کو نظرانداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس میں کامیابی ممکن نہیں ہوتی۔ اسی طرح ذرائع ابلاغ میں میرے یہ دوست جہاں جہاں موجود ہیں یہ ان لوگوں کو جن کے بارے میں وہ رجعت پسندی کا فتویٰ دے چکے ہیں، رستے سے ہٹانے کا ''فریضہ'' انجام دیتے رہتے ہیں، جبکہ میرے ادیب دوستوں کی اکثریت بائیں بازو سے تعلق رکھتی ہے اور وہ مجھ سے اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ متعصب صرف ''ست ماہی'' ترقی پسند ہیں۔ میں شاعروں میں فیض، ندیم، فراز اور بیسیوں دوسرے بڑے شاعروں اور اسی طرح دانشوروں میں سے سہیل وڑائچ، وجاہت مسعود، نصرت جاوید، عباس اطہر مرحوم اور دوسرے ترقی پسند دوستوں کی محبت دل سے کیسے نکالوں۔ دوسری طرف مجیب الرحمٰن شامی، حامد میر، سلیم صافی، جاوید چودھری، انصار عباسی، مطیع اللہ جان، ابصار عالم اور طلعت حسین جن میں سے کچھ دائیں اور کچھ بائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں، کو اپنے دل سے کہاں لے جاؤں کہ یہ دوست قائد اعظمؒ اور پاکستان سے عشق کرتے ہیں اور اپنے ضمیر کے غدار نہیں ہیں۔ آپ بتلاؤ کہ ہم بتائیں کیا۔ کیہہ جاناں میں کون آں بُلھیا!

پس نوشت: میری دوستیاں تو ان لکھنے والوں سے بھی ہیں جن کے نظریات اور میرے نظریات میں بعد المشرقین ہے، جس کی ایک مثال حسن نثار ہے، وہ میرا دوست ہے، میں اس کا دوست ہوں۔ میرے نزدیک انسانی روابط بہت اہمیت کے حامل ہیں، ان میں دراڑ نہیں آنا چاہئے!

یہ بھی ایک لائف اسٹائل ہے

تحریر: جاوید چوہدری

میں ۲۰ سال قبل ٹریننگ اور سیلف ہیلپ کے بزنس میں آیا اور پرسنل ٹریننگز شروع کر دیں‘ بھابڑا بازار کا ایک بزرگ میرا پہلا کلائنٹ تھا‘ وہ شیخ برادری سے تعلق رکھتا تھا‘ پوری زندگی محنت اور مشقت میں گزار دی‘ دو بیٹے تھے‘ دونوں شادی شدہ اور خود مختار تھے‘ بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ یار دوست اور عزیز رشتے دار تھے نہیں‘ بزرگ کی کوئی ایکٹویٹی‘ کوئی تفریح اور زندگی کے ساتھ کوئی دل چسپی بھی نہیں تھی لہٰذا وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہو گیا‘ وہ سارا سارا دن گلیوں اور بازاروں میں مارا مارا پھرتا رہتا تھا‘ سڑک پر بندر کا تماشا لگتا تھا تو بزرگ دو دو گھنٹے وہاں کھڑے رہتے تھے اور بچے انھیں تلاش کرتے رہتے تھے‘ میرے قاری تھے‘ یہ ان کی زندگی کی واحد ایکٹویٹی تھی‘ میں نے سیلف ہیلپ کے بارے میں لکھنا شروع کیا تو ان کا بڑا بیٹا ایک دن انھیں میرے پاس لے آیا‘ اس کا کہنا تھا ”یہ آپ کی بات کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔ آپ انھیں سمجھائیں“ میں نے انھیں آدھے دن کے لیے اپنے پاس رکھ لیا‘ ان کی ساری کہانی سنی‘ وہ ایک لوئر مڈل کلاس شخص کی مشقت اور حسرتوں سے لتھڑی عام سی کہانی تھی‘ بچپن میں والد کا انتقال ہو گیا‘ تعلیمی سلسلہ درمیان میں رک گیا‘ غلہ منڈی میں لوڈر کا کام کیا‘ بہن بھائی پالے‘ سبزی منڈی میں بیوپار کیا‘ کام یاب ہو گئے‘ جی بھر کر پیسے کمائے‘ بیوی اور بچے پالتے رہے‘ بچے بڑے ہوئے‘ شادی کی اور وہ اپنے اپنے گھروں میں آباد ہو گئے اور آخر میں بیوی کا انتقال ہو گیا تو یہ خود کو اکیلا محسوس کرنے لگے۔

میں نے یہ ساری کہانی سننے کے بعد ان سے دو سوال کیے‘ ایک‘ آپ کے پاس کتنی دولت ہے اور دوسرا وہ کون سا کام تھا جو آپ پوری زندگی کرنا چاہتے تھے لیکن اب تک نہیں کر سکے؟ ان کا پہلا جواب تھا میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے‘ میں نے اپنی دولت بیٹوں میں تقسیم کر دی ہے‘ انھیں دکانیں اور گھر بنا دیے ہیں۔

میرے پاس اب صرف دس مرلے کا گھر بچا ہے اور گزارے کے پیسے ہیں‘ میں نے پوچھا ”آپ کے گھر کی مالیت کتنی ہے؟“ وہ اطمینان سے بولے ”دو ماہ قبل اس کے دس کروڑ روپے مل رہے تھے“ میں نے حیرت سے پوچھا ”دس کروڑ روپے دس مرلے کے گھر کے؟“ میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں یہ ۲۰۰۰ کی بات تھی اور اس زمانے میں دس کروڑ روپے بہت بڑی رقم ہوتی تھی‘ اسلام آباد کے پوش سیکٹرز میں دو کروڑ روپے میں ڈیڑھ کنال کا گھر مل جاتا تھا‘ وہ ہنس کر بولے ”میرا گھر کمرشل ایریا میں آ گیا ہے‘ پوری گلی میں دکانیں بن چکی ہیں۔

صرف میرا گھر بچا ہے لہٰذا یہ ٹھیک ٹھاک مہنگا ہے“ میں نے لمبا سانس لیا اور اس کے بعد ان سے دوسرے سوال کا جواب مانگا‘ وہ شرما کر بولے ”میں جوانی میں ایک بار لاہور کے ہلٹن ہوٹل میں گیا تھا‘ اس کی صفائی‘ سروس اور خوب صورتی میرے دل میں کھب گئی‘ میں کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں دو تین دن رہنا چاہتا ہوں‘ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے‘ میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے ان سے پوچھا ”کیا آپ کی زندگی میں کوئی ذمے داری باقی ہے“ وہ آہ بھر کر بولے ”ہرگز نہیں‘ میں سب سے فارغ ہو گیا ہوں“ میں نے ان سے پوچھا ”کیا آپ میرے مشورے پر عمل کریں گے“ وہ خوش دلی سے بولے ”سو فیصد“ میں نے عرض کیا ”آپ پھر اپنا مکان بیچ دیں‘ پیسوں کو تین حصوں میں تقسیم کر دیں‘ ایک حصے سے کوئی کمرشل بلڈنگ خرید لیں اور اسے کرائے پر دے دیں۔

باقی دونوں حصوں کو دو مختلف بینکوں میں رکھیں اور خود پوری زندگی کے لیے فائیو اسٹار ہوٹل میں شفٹ ہو جائیں“ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے اور بولے ”کیا یہ ممکن ہے“ میں نے ہنس کر جواب دیا ”سو فیصد“ وہ بولے ”آپ اپنی ان تینوں تجاویز کو ذرا ایکسپلین کر دیں“ میں نے عرض کیا ”میں آخری تجویز سے اسٹارٹ کرتا ہوں‘ آپ جب فائیو اسٹار ہوٹل سے پیکیج ڈیل کریں گے تو یہ آپ کے ساتھ دس ہزار روپے روزانہ کے حساب سے ڈیل کر لیں گے‘ یہ رقم ماہانہ تین لاکھ روپے اور سالانہ ۳۶ لاکھ روپے بنتی ہے۔

ہم اگر ۳۶ لاکھ کو دس سے ضرب دیں تو یہ تین کروڑ ۶۰ لاکھ روپے بنیں گے اور یہ آپ کے مکان کی مالیت کا ۳۶ فیصد ہو گا‘ آپ گویا اپنی دولت کے ۳۶ فیصد میں دس سال فائیو اسٹار ہوٹل میں رہ سکتے ہیں‘ آپ کی عمر اس وقت ۶۶ سال ہے‘ آپ دس سال بعد ۷۶ سال کے ہوں گے‘ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر دے‘ آپ اس کے بعد اگلے دس سال دوسرے اکاؤنٹ سے ادائیگی کریں اور ۸۶ سال کی عمر تک فائیو اسٹار ہوٹل میں رہیں‘ اللہ نے اگر آپ کو مزید مہلت دی تو ہمارے پاس ایک کمرشل پراپرٹی ہو گی۔ اس کی مالیت بھی اس وقت تک کم از کم دس کروڑ ہو چکی ہو گی اور ہم اس رقم سے مزید بیس تیس سال فائیو اسٹار ہوٹل میں رہ لیں گے“ وہ بے چینی سے کرسی پر تڑپے اور پوچھا ”کیا ہوٹل مجھے پوری زندگی دس ہزار روپے میں کمرہ دے دے گا‘ اس کے ریٹس بھی تو بڑھیں گے“ میں نے ہنس کر جواب دیا ”ہاں بڑھیں گے لیکن میں نے پہلے مشورے میں آپ کو بتایا تھا ہم گھر کی رقم کے ایک حصے سے کمرشل پراپرٹی خریدیں گے اور اسے کرائے پر دے دیں گے۔

اس پراپرٹی کا کرایہ ہوٹل کی پے منٹ کو بیلنس کرے گا جب کہ میں نے دوسرے حصے میں آپ کو مشورہ دیا آپ رقم کے دو حصے دو مختلف بینکوں میں رکھیں‘ آپ کا سوال ہونا چاہیے دو مختلف بینکوں میں کیوں؟ کیوں کہ اگر خدانخواستہ کوئی ایک بینک ڈیفالٹ کر جائے تو بھی ہمارے پاس آدھی رقم بچی رہے گی‘ ہمارا لائف اسٹائل ڈسٹرب نہیں ہو گا“ وہ تھوڑی دیر سوچتے رہے اور پھر بولے ”کیا یہ میرے بچوں کے ساتھ زیادتی نہیں ہو گی؟ میرا مکان میرے بچوں کی امانت ہے“ میں نے ہنس کر جواب دیا ”شیخ صاحب آپ کے بچے جوان اور خود مختار ہیں۔ یہ اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں‘ اپنا کام کر رہے ہیں‘ ان کو آپ کا مکان

نہیں چاہیے اور اگر چاہیے بھی تو بھی ان کا اس پر کوئی حق نہیں بنتا‘ آپ نے ان کی پرورش کی‘ تعلیم دلائی‘ برسرروزگار کیا اور شادیاں کرا دیں‘ اب ان کا فرض ہے یہ اپنی اور اپنے خاندان کی ذمے داری اٹھائیں‘ دوسرا آج آپ کے مکان کی مالیت دس کروڑ روپے ہے‘ آپ فائیو اسٹار ہوٹل میں بھرپور زندگی گزارنے کے بعد بھی ان کے لیے دس کروڑ روپے کی کمرشل پراپرٹی چھوڑ جائیں گے‘ آپ ان کا حق نہیں ماریں گے‘ آپ انھیں حق سے زیادہ دے کر جائیں گے“۔ شیخ صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے‘ وہ اٹھے اور مجھے گلے لگا لیا۔

شیخ صاحب نے میرے مشورے پر عمل کیا‘ اپنا گھر دس کروڑ ۸۰ لاکھ روپے میں فروخت کر دیا‘ صدر میں چار کروڑ روپے کا پلازہ خریدا اور کرائے پر چڑھا دیا‘ چھ کروڑ اسی لاکھ روپے بچ گئے‘ تین کروڑ ۴۰ لاکھ روپے ایک بینک اور دوسری رقم دوسرے بینک میں جمع کرا دی‘ ہوٹل کے ساتھ ان کی ساڑھے نو ہزار روپے ڈیلی کی ڈیل ہو گئی‘ اس رقم میں تمام سروسز شامل تھیں‘ وہ ہوٹل میں شفٹ ہوئے اور بادشاہوں جیسی زندگی گزارنے لگے۔

کمرہ اور باتھ روم ہر وقت صاف‘ ناشتہ اور کھانا اعلیٰ‘ جم اور سوئمنگ پول کی سہولت‘ ڈاکٹرز ۲۴ گھنٹے دستیاب اور ہفتے میں دو دن مساج اور اسٹیم باتھ اور سوانا روزانہ‘ شیخ صاحب دوبارہ جوان ہو گئے‘ وہ ہوٹل میں ہونے والے تمام سیمینارز‘ ورکشاپس اور کانفرنسز بھی اٹینڈ کرتے تھے اور ملک کے تمام بڑے اور مشہور لوگوں سے بھی ملتے تھے‘ ان سے کوئی کھلاڑی بچا‘ ایکٹر اور نہ ہی سیاست دان‘ وہ سب سے ملے اور تصویریں بھی بنوائیں‘ سال بعد انھوں نے اپنا اسٹائل بدل لیا‘ وہ چھ ماہ کے لیے کراچی کے ہوٹل میں شفٹ ہو گئے‘ اگلے چھ ماہ لاہور رہے اور پھر چھ ماہ کے لیے دوبارہ راولپنڈی آ گئے‘ گاڑی اور لانڈری ہوٹل کی استعمال کرتے تھے‘ دو برسوں میں پلازے کا کرایہ بھی اکٹھا ہو گیا۔

شیخ صاحب نے اس سے دوبئی میں ہوٹل بک کرایا‘ فرسٹ کلاس میں سفر کر کے دوبئی گئے اور چھ ماہ دوبئی گزار کر واپس آ گئے‘ میں ان سے ملنے جاتا تھا تو وہ مجھے سینے سے لگا کر رونے لگتے تھے اور بار بار کہتے تھے ”تم میرے محسن ہو‘ تم نے بھابڑا بازار کے مزدور کو بادشاہ بنا دیا‘ میں جانتا ہی نہیں تھا میں اتنا امیر ہوں اور میں اپنی رقم سے کیسی شاندار زندگی گزار سکتا ہوں“ وہ کہا کرتے تھے ”میں اگر بھابڑا بازار میں رہتا تو کبھی کسی سیاست دان‘ کھلاڑی اور اداکار سے ملاقات ہو سکتی تھی اور نہ ہی میں زندگی کی اصل مسرتیں حاصل کر سکتا‘ میرا امکان اگر اس دوران ۵۰ کروڑ روپے کا ہو جاتا تو بھی مجھے کیا فائدہ ہوتا؟ میں تو گلیوں میں رُل کر ختم ہو گیا ہوتا“ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ جاتے تھے‘ شیخ صاحب ساڑھے چھ سال فائیو اسٹار ہوٹلوں میں رہ کر ۲۰۰۶ میں فوت ہو گئے۔ انتقال کے بعد ان کے اثاثوں کا تخمینہ لگایا گیا تو ان کا کمرشل پلازہ ساڑھے تیرہ کروڑ روپے کا ہو چکا تھا اور ان کے اکاؤنٹ میں اس وقت بھی سوا کروڑ روپے تھے‘ میں نے ان کا آخری دیدار کیا‘ ان کے چہرے پر اطمینان بھی تھا اور مسکراہٹ بھی‘ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہے ہوں‘ یہ بھی تو ایک لائف اسٹائل ہے‘ انسان مزدور کی زندگی گزارے اور آخر میں بادشاہ بن کر دنیا سے رخصت ہو‘ انسان کی کوئی خواہش ادھوری نہ رہے۔

❁❁❁

Lahore International Magazine

@lahoreintl

@lahoreintl

lahoreinternational

lahoreinternational

lahoreintl

+447940077825

+447940077825

lahoreintlondon@gmail.com

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لیے مختصر دورانیے کی ڈاکومینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکومینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی،......ہو۔ ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ.....اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند نا پسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

شعبہ پاکستان

مذہب کی آڑ میں سیاسی ناکامیاں چھپانے کی کوشش

تحریر: سید مجاہد علی

امریکہ نے واضح کیا ہے کہ اسے پاکستان کے ساتھ وسیع الجہتی تعلقات کی ضرورت نہیں ہے البتہ افغانستان کی صورت حال کے حوالے سے تعاون جاری رہے گا۔ تاہم پاکستان کی وزارت خارجہ نے اس معاملہ پر خاموش رہنا مناسب خیال کیا ہے۔ پاکستانی میڈیا میں مسلسل چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ پاک فوج میں حالیہ تبدیلیوں کے بارے میں طریقہ کار کے مطابق وزیر اعظم ہاؤس سے نوٹی فیکیشن جاری نہیں ہوا۔ کیا یہ حکومت اور فوج کے درمیان عدم اعتماد کی نشانی ہے؟ وزیر اعظم ہاؤس نے اس پر کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ وزیر اعظم عمران خان نے البتہ عید میلاد النبی ﷺ کے حوالے سے عشرہ رحمت للعالمین منانے کا اعلان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں منعقد ہونے والی پہلی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے عمران خان نے 'رحمت للعالمین اتھارٹی' بنانے کا اعلان کیا اور بتایا کہ اس اتھارٹی کے سرپرست وہ خود ہوں گے اور یہ ادارہ پاکستان اور دنیا میں اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرے گا، اسلامی تاریخ کی شان و شوکت بیان کرے گا اور اس مدینہ ریاست کا سبق عام کیا جائے گا جو رسول پاک ﷺ کی قیادت میں انتہائی مختصر وقت میں معرض وجود میں آئی اور آج بھی بنی نوع انسان کے لئے مثال ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ پاکستان کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اسے مغربی 'فحاشی' سے نجات دلا کر سنت نبویؐ کے راستے پر گامزن کیا جائے کیوں کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ 'اگر مسلمان رسولؐ کا بتایا ہوا راستہ اختیار کریں گے تو وہ اس ملک کو اوپر لے جائے گا'۔ اب وزیر اعظم کی قیادت میں اس سبق کو عام کرنے کا اہتمام ہو گا تاکہ پاکستان پر رحمتوں کا نزول ہو۔

پاکستان کی مختصر تاریخ گواہ ہے کہ کوئی بھی حکومت اور لیڈر اسی وقت مذہب کو 'لاٹھی' بنانے کا عزم کرتا ہے جب اس کے پاس عوام کو درپیش مسائل کا کوئی حل نہ ہو اور حقیقی مسائل سے توجہ مبذول کروانے کے لئے عقیدہ کو ہتھکنڈا بنا کر لوگوں میں افتراق، بے چینی اور پریشان خیالی کو عام کرنا مقصود ہو تاکہ حکمران وقت کی سیاسی غلطیوں کی بجائے معاشرے میں غیر ضروری مباحث کا آغاز ہو۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ایسی ہی مشکل سے نجات پانے کے لئے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے، شراب پر پابندی لگانے اور جمعہ کو ہفتہ وار چھٹی جیسے اقدامات کئے تھے لیکن یہ 'دینی اقدامات' بھی نہ تو ان کے اقتدار کو طول دے سکے اور نہ ہی انہیں پھانسی کے پھندے سے بچا سکے۔ ان کے جانشین ضیا الحق نے افغانستان میں سوویت کمیونزم کے خلاف امریکی جنگ کو اسلامی جہاد کا لبادہ پہنا کر نفرت، فرقہ پرستی، انتہاپسندی اور تشدد کا بیج بویا تھا۔ اس شدت پسندی سے پیدا ہونے والے رجحانات نے پاکستانی معاشرہ کو اندر سے کھوکھلا کیا اور ملکی معیشت بتدریج روبہ زوال ہوئی۔

اسی فوجی آمر نے خود کو اللہ کا سپاہی ثابت کرنے اور پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کے لئے توہین مذہب کے قانون میں انسانیت سوز شقات شامل کیں۔ ان شقات کی وجہ سے ملک میں توہین مذہب کو مذاق بنا لیا گیا اور ہر طبقہ کے لوگ اسے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کر کے مذہب کی بدنامی کا سبب بنتے ہیں۔ تاہم اس معاملہ کی مذہبی حساسیت کی وجہ سے کسی کو ان قوانین کو تبدیل کرنے یا ضیا الحق کی ناجائز ترامیم ختم کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ توہین مذہب کا یہ قانون نافذ ہونے کے بعد سے یوں گمان ہونے لگا ہے کہ پاکستان میں لوگوں کا واحد مشغلہ ہی توہین مذہب ہے جس کے تدارک کے لئے ضیا الحق جیسے مرد مومن کو ایسی شقات نافذ کرنا پڑیں جو نہ تو کسی دوسرے اسلامی ملک میں دکھائی دیتی ہیں اور نہ ہی اسلامی فقہ میں اس کی کوئی ناقابل تردید مثال تلاش کرنا ممکن ہے۔

اس کے باوجود پاکستان اس سفر رائیگاں سے گریز کا سامان کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اب عمران خان پر یہ القا ہوا ہے کہ گزشتہ پندرہ سو برس کے دوران کسی مسلمان کو اسلامی تاریخ، سیرت النبی ﷺ اور مدینہ ریاست کی خوبیاں سامنے لانے کی توفیق نہیں ہوئی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے شاید انہیں اس نیک کام کے لئے چن لیا ہے۔ وزیر اعظم کا دعویٰ ہے کہ ترقی و خوشحالی کے لئے کوئی کام اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا جب تک اس ملک کے عوام سیرت النبی ﷺ سے مکمل طور سے آگاہ نہ ہوں اور سنت نبویؐ پر عمل پیرا نہ ہوں۔ اس لئے اب رحمت للعالمین اتھارٹی کے ذریعے یہ مقصد حاصل کیا جائے گا۔ اسلام آباد کی تقریب میں طویل تقریر کے دوران عمران خان نے اس اتھارٹی کے حوالے سے جو باتیں کی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں خود بھی اس کے خدوخال سے آگاہی نہیں ہے۔ لیکن وہ امور حکومت کے ہر پہلو میں اپنی حکومت کی ناکامیوں کو عوام کی 'بداخلاقی'، 'لاعلمی اور گمراہی' کا سبب قرار دے کر اب دین کے نام پر ایک نیا شوشہ چھوڑ رہے ہیں اور ملک

میں ایک نئے افتراق اور پریشان خیالی کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔انہیں اس بات سے غرض نہیں کہ ان کے اقدامات سے ملک میں پہلے سے غیر محفوظ مذہبی اقلیتوں کے حقوق متاثر ہوں گے یا مسلمانوں میں فروغ پانے والی انتہاپسندی مزید راسخ ہوگی جس سے دہشت گردی کا سبب بننے والی شدت پسندی پھیلے گی۔نفرت اور انتہاپسندی سے نجات پانے کے کسی منصوبہ کا اعلان کرنے کی بجائے سرکاری سرپرستی میں تعصّبات اور خودپسندی کے ایک نئے مزاج کو عام کرنے کا اعلان کیا جارہا ہے۔

مغربی ممالک کے کامیاب انسانوں کو گمراہ کرنے والے رول ماڈل قرار دے کر ملک کے وزیراعظم نے اپنے نوجوانوں کو پیغام دیا ہے کہ اللہ کا بتایا ہوا سیدھا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔اسی راستے کے خدوخال واضح کرنے کے لئے اب عمران خان نے خود اپنی نگرانی میں رحمت للعالمین اتھارٹی بنائی ہے۔ان کا دعویٰ ہے کہ اس اتھارٹی کے مختلف شعبوں کو مسلمہ اسلامی اسکالروں کی نگرانی میں چلایا جائے گا۔تاہم وہ یہ بتانے سے قاصر رہے کہ خود اپنے بقول ساری زندگی ’گمرہی‘ میں گزارنے کے بعد وہ خود کو کیسے اس قابل سمجھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی زندگی سے سبق سیکھنے کی تگ ودو کرنے کی بجائے، وہ اس اتھارٹی کا سرپرست اعلیٰ بن رہے ہیں جو پاکستان کے علاوہ باقی دنیا کے لوگوں کو بھی دین کا درست راستہ بتائے گی؟ اور جس میں ہر کام اسلامی اسکالروں کی رہنمائی میں انجام پائے گا۔کیا ایک خالص مذہبی ادارے کو سیاسی نگرانی میں دینے کا واحد مقصد اسے سیاسی فائدے کے لئے استعمال کرنا نہیں ہے؟

’رحمت للعالمین اتھارٹی‘ کا نقشہ ابھی غیر واضح ہے تاہم وزیراعظم نے آج اس حوالے سے جو باتیں کی ہیں، ان سے یہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ وہ اپنی حکومت کی انتظامی، معاشی اور دیگر شعبوں میں ناکامی کو چھپانے کے لئے اب مذہبی لبادہ پہن کر خود کو تقدیس کے کسی ایسے مقام پر فائز کرنے کا ارادہ ظاہر کر رہے ہیں جو ہر قسم کی تنقید اور احتساب سے بالا ہوگا۔
عمران خان کی نگرانی میں یہ اتھارٹی نصاب تعلیم سے لے کر میڈیا پر نشر ہونے والی ہر بات کی نگرانی کا فریضہ ادا کرے گی۔یہ وہی طریقہ جو دنیا کے بدترین فاشسٹ لیڈر اپنے اپنے وقت میں اختیار کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔مذہبی علامات استعمال کر کے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کا طریقہ عمران خان کی خواہش کے مطابق شاید انہیں ’ناقابل تسخیر‘ تو نہ بنا سکے لیکن پہلے سے تقسیم شدہ معاشرہ میں مزید انتشار ضرور پیدا ہوگا۔ایک ایسے موقع پر جب مذہب اور ریاست کو الگ کرنے کے اقدامات ضروری تھے، عمران خان کی حکومت وہ کام بھی اپنے ذمہ لینا چاہتی ہے جو ملک کے لاکھوں مولوی اور قریب ۳۵۰۰۰ مدارس پہلے سے انجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔اس سے پہلے خیراتی منصوبوں کو احساس پروگرام کے نام پر ’نیشنلائز‘ کرنے کی کوشش کی جاچکی ہے۔اب دین کی تفہیم میں سرکاری اور غیر سرکاری اسلام کی نئی تقسیم پیدا کرنے کا افسوسناک کام کیا جائے گا۔

عمران خان نے اسلامی ریاست کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ: ’حضور ﷺ کی ساری محنت انسانوں کے لئے تھی۔دنیا کی بڑی جمہوریتیں بھی تصور نہیں کر سکتیں کہ خلیفہ وقت حضرت علیؓ ایک یہودی شہری سے عدالت میں کیس ہار جاتے ہیں۔حضرت علی کا مقام دیکھیں کتنا بڑا تھا لیکن جج کہتا ہے میں آپ کی بیٹی کی گواہی قبول نہیں کرتا۔یہ انسانیت کا نظام تھا اور سب انسان برابر تھے۔ایک یہودی کو بھی ملک کے سربراہ سے وہی انصاف مل رہا تھا‘۔
وزیراعظم تاریخ کا سبق یاد کروانے سے پہلے اگر یہ بتادیتے کہ ان کے نئے پاکستان میں انصاف کی فراہمی کے لئے کیا اقدامات کئے گئے اور کیا انہوں نے ملکی اقلیتوں کے خلاف ہونے والے کسی ایک واقعہ کا نوٹس لے کر کسی قصوروار کو کیفر کردار تک پہنچانے کا اہتمام کیا ہے؟اسی طرح یہ بیان کہ ’سیرت نبوی ﷺ انسانوں کو اکٹھا کرنے کا تصور تھا۔قیادت کا پیمانہ دیا کہ ایک قائد انسانوں کو اکٹھا کرتا ہے، نفرتیں پھیلا کر تقسیم نہیں کرتا‘۔کیا عمران خان خود اپنا سراپا اس آئینے میں دیکھنے کا حوصلہ کر سکتے ہیں؟ان کی گفتگو، طرز سیاست اور الزام تراشی کے ہتھکنڈوں نے اس قوم کو تقسیم کیا ہے۔ملک میں گروہ بندی بڑھی ہے اور نفرتوں میں اضافہ ہوا ہے۔وہ اپنے سیاسی مخالفین پر ایسے الزامات عائد کرتے ہیں جو ابھی تک کسی عدالت میں ثابت نہیں ہوئے۔پاناما پیپرز سامنے آنے پر مخالفین کو کیفر کردار تک پہنچانے کا تہیہ کرنے والے پنڈورا پیپرز میں اپنے ساتھیوں کے کارناموں پر خاموش ہونا بہتر سمجھتے ہیں۔اس کے باوجود وہ ’عظمت اور خود ساختہ دیانت‘ کا تاج پہنے خود کو سرفراز کرنے میں حجاب نہیں کرتے۔عمران خان جان لیں کہ ملک میں مہنگائی، معاشی پریشانی، اجناس کی کمیابی اور بدامنی اصل مسائل ہیں۔حکومت ان مسائل پر توجہ دینے کی بجائے تبلیغ دین کو اپنا نصب العین قرار دے کر اپنی ناکامی کا اقرار کر رہی ہے۔یہ اعلانات وزیر اعظم اور حکمران جماعت کی سیاسی غلطیوں اور معاشی ناکامیوں پر پردہ نہیں ڈال سکیں گے۔

❁❁❁

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہوچکا ہے۔تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ۔

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

ہمارے شرفاء

تحریر: جاوید قاضی

آج پاناماپیپرز سے لے کر پینڈورا پیپرز تک میں ایک نیا ترانہ سامنے آیا ہے، وہ ترانہ ہے ''دنیا کے صحافیو، ایک ہوجاؤ'' اس لوٹی ہوئی دولت کے خلاف جو غریب ملکوں کی اشرافیہ نے اپنے لوگوں کو سہولتیں نہ دے کر بنائی ہے اور ان امیر ممالک نے آنکھیں بند کرلیں اور یہ سب کچھ ہونے دیا، اپنے بینک، اپنے کاروبار، اپنی جائیدادیں ان کو خریدنے دیں۔ ہاں مگر پچھلی بار پاکستان میں پاناما لیکس، جمہوریت کے خلاف استعمال ہوئی، وہ بین الاقوامی سچ تو تھا مگر اس کا نشانہ وہ نہ بنے جن کو بننا چاہیے تھا، پھر پاناما تو کہیں اور چلا گیا، نیب کورٹ کے جج ارشد ملک کی روداد تو آپ کو پتا ہوگی۔ کس نے کہا نواز شریف اور زرداری نے کچھ نہیں کیا۔ اس سے اہم سوال یہ ہے کہ صرف یہ کیوں؟ یہاں تو جنرل مشرف سے لے کر بہت سے نام ہیں جن پر لب کشائی کرنے کی تو مجھ میں اب بھی جرات نہیں۔ لگ بھگ سات سو شرفاء کے نام اس بار پینڈورا پیپرز میں آئے ہیں جن کا تعلق پاکستان سے ہے۔ بیچارہ ہندوستان ایک ارب تیس کروڑ سے زائد لوگوں کا ملک، ہم سے پانچ گناہ بڑا ملک، بس صرف تین سو لوگ؟ اور وہاں سے ایک بھی ایسا بندہ نہیں جس کی آف شور کمپنی ہو اور دفاعی امور میں افسر ہو۔ ان سات سو لوگوں میں اکثر لوگوں کا تعلق حکمران جماعت سے ہے۔ اب تو کیا خوب ہوا ہے کہ خود وزیر اعظم اس سیل کی سربراہی کریں گے حالانکہ پاناما کے زمانے میں ہماری سپریم کورٹ اور ان کی نگرانی میں جے آئی ٹی دیکھا کرتی تھی۔

پینڈورا پیپرز میں ۳۵ راہبران، روس کے ولادی میر پیوٹن سے لے کر موجودہ و سابق وزیر اعظم، صدر رہیں یار ہے ہوں گے اور دیگر کھرب پتی لوگ ہیں۔ جو رقم اس کالے دھندے میں، بے نامی کمپنیوں میں موجود ہے، وہ پانچ ہزار ارب ڈالر سے لے کر ۳۲ ہزار ارب ڈالر تک ہے، جو امریکا کی ایک سال کی مجموعی پیداوار سے بھی زیادہ ٹھہرتی ہے، جو دو، تین ہزار لوگوں کے پاس ہے جن کی یہ آف شور کمپنیاں ہیں جن کے پیچھے یہ لوگ ہیں اور یہ لوگ پینڈورا پیپرز نے ظاہر کر دیے۔ سوال یہ ہے کہ یہ پیسا کہاں سے آیا؟ پیسا اکٹھا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جو بین الاقوامی سرکاری سطح پہ معاہدے کیے جاتے ہیں جس میں سے ایسے ممالک کی حکومت ٹینڈر کال کرتی ہے۔ جو اس میں کمیشن ہوتا ہے، اس بین الاقوامی ٹھیکیداروں کی طرف سے حکومت میں موجود لوگوں کو ملتا ہے۔ اور یہ پیسے ایسے لیڈروں کے فرنٹ مین کی آف شور کمپنی میں ڈالے جاتے ہیں۔ یہ کمپنیاں صرف نام کی ہوتی ہیں، ان کا کوئی بھی کاروبار نہیں ہوتا، نہ ہی کسی اسٹاک ایکسچینج میں یہ لسٹڈ ہوتی ہیں۔ ایسے کئی مقامی ٹھیکیدار بھی ہیں جن سے حکومتیں راستے، انفرااسٹرکچر وغیرہ بنواتی ہے اور کمیشن کبھی بھی بینک اکاؤنٹ کے ذریعے نہیں لی جاتی یا تو وہ نقدی میں لی جاتی ہے یا پھر ایسی کمپنیوں کے آڑ میں لی جاتی ہے جو بظاہر کسی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں اور ان بے نامی کمپنیوں کے بینک اکاؤنٹ میں جاتی ہے۔ یہ ہے ہماری اشرافیہ اور تیسری دنیا کے غریب لوگوں کے رہبر۔ ان غریبوں کو دینے کے لیے ان کے پاس بہت بڑے نعرے ہیں، وعدے ہیں۔ آپ ہی کہتے تھے جب پٹرول کی قیمت بڑھنے لگے تو سمجھ لیں کے آپ کے حکمران کرپٹ ہیں۔ آپ ہی کہتے تھے کہ اگر آئی ایم ایف کو پاس جانا پڑا تو اس سے پہلے خودکشی کرلوں گا۔ یہ سب جن کی جائیدادیں ہیں کالے دھندے ہیں، آف شور کمپنیاں ہیں، ان کو بقا کے لیے کی سیاست کی جاتی ہے، جو اقتدار کے قریب رکھتی ہے، اس سے نہ صرف اور اثاثے بنائیں گے بلکہ جو ان کے موجودہ اثاثے ہیں ان کا تحفظ بھی اسی میں ہے۔ ہمارے وڈیرے سیاست کیوں کرتے ہیں؟ اور وہ بھی اقتداری سیاست۔ اس لیے کے ان کی زمینوں پہ قبضے ہوجائیں گے اگر وہ سیاست نہیں کریں گے۔ اس لیے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ وڈیرہ شاہی کا نظام ٹوٹے، یہ پاکستان کے شرفاء ہے، انھوں نے اقتدار میں اس کے ساتھ رہنا ہے جس سے ان کو اور ان کے اثاثوں کو تحفظ ملے۔ پاکستان میں سب سے مضبوط اسٹیبلشمنٹ ہے۔ یہ ان کے کہنے پہ کسی پارٹی میں آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ یہ جو بڑی پارٹیاں ہیں پیپلزپارٹی کی شکل میں یا پی ایم ایل نون کی شکل میں یہ بھی اسٹیبلشمنٹ سے زیادہ دیر تک ٹکراو برداشت نہیں کرسکتیں، اس لیے کہ پھر جو ان پارٹیوں کے اندر شرفاء ہیں وہ ہل جاتے ہیں، ان پارٹیوں کے محور سے۔ اس میں کچھ تبدیلی بھی آئی ہے، اب کے بار جو پنجاب کا مجموعی بیانیہ ہے وہ اسٹیبلشمنٹ یا مروج ریاستی بیانیے سے متفق نہیں، وہاں یہ اب شرفاء کم ان کی مڈل کلاس سوچ زیادہ ابھری ہے اور یہ سارے لوگ اب اس طرح نہیں چاہتے جس طرح ملک چل رہا ہے۔ یہ بھی فرق ہے کہ ہندوستان کی اشرافیہ سے تین سو افراد پینڈورا پیپرز نے عیاں کیے ہیں اور ہمارے سات سو افراد۔ یہ جو غبار ہے یہ عکس ہے اس ملک کا آئین پر نہ چلنے کا ثمر ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے جو ۱۹۸۵ کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا کیونکہ وہ غیر جماعتی تھے اس سے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوا۔ جنرل ضیاء الحق نے جمہوری قوتوں کو کمزور کرنے کے لیے ان شرفاء کو ڈرایا دھمکایا اور خریدا۔ کچھ کچھ باتیں الٰہی بخش سومرو نے بھی ایک انٹرویو میں میرے ساتھ کیں، کیسے پھر سب کے سب پیر پگاڑا کی چھتری کے نیچے آگئے۔ بات نکلے گی تو دور تلک جائے گی۔ ابھی اور بھی بہت کچھ ہونا ہے، ہم تہارہ گئے ہیں۔ اس بیانیے کی وجہ سے جو شرفاء کے مفادات کا ترجمان ہے۔ آئین سے انحراف اور انتخابات میں منظم دھاندلی کرانے کی وجہ سے ہم دنیا سے تو لڑ سکتے ہیں مگر ہم اپنے لوگوں کی مخالفت برداشت نہیں کرسکتے۔ یہ شرفاء کا پاکستان ہے، یہ شرفاء جس کی شکل آپ کو پینڈورا پیپرز میں نظر آرہی ہے۔ جب ادارے مضبوط نہیں ہوتے، جب ملک آئین پر نہیں چلتا جب تاریخ کو مسخ کیا جائیگا تو پھر یہ ہے پینڈورا پیپرز کی روداد۔ اگر ہندوستان میں تین سو افراد پینڈورا کے ریڈار نے پکڑ لیے ہیں تو اس اعتبار سے ہمارے ہاں سے صرف ستر لوگ نکلتے کہ ہم کہہ سکتے کہ ہمارا حال بھی اتنا برا ہے جتنا ان کا۔ ❀❀❀

مہٹہ پیلس، تاریخ کے جھروکوں میں!

تحریر: ڈاکٹر رمیش کمار وانکوانی

ابھی ایک خبر میری نظر سے گزری ہے کہ سندھ ہائی کورٹ نے شہر قائد میں واقع مہٹہ پیلس کا نام استعمال کرنے سے روک دیا ہے، میڈیا رپورٹس کے مطابق قائد اعظم اور فاطمہ جناح کی جائیداد کی تقسیم کیلئے لواحقین میں مقدمہ بازی جاری ہے۔ مذکورہ خبر نے مجھے تاریخ کے جھروکوں میں جھانکنے پر مجبور کر دیا جب قیامِ پاکستان سے صرف ۱۴ سال قبل کلفٹن کے علاقے میں تعمیر ہونے والا مہٹہ پیلس ہر خاص و عام کی توجہ کا مرکز ہوا کرتا تھا، یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریز کے دورِ حکومت اور آزادی کے بعد بھی ایسی عظیم الشان اور پرشکوہ عمارت کبھی تعمیر نہیں ہوئی۔ دو منزلہ مہٹہ پیلس راجستھان کے علاقے جے پور کے فن تعمیر کا ایک عملی نمونہ ہے جہاں مغلیہ دور کی جھلک بھی نظر آتی ہے، جب پہلی مرتبہ میں نے اس متاثر کن محل کا دورہ کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں دورِ قدیم میں پہنچ گیا ہوں جب برصغیر پر راجاؤں مہاراجاؤں کی حکومت ہوا کرتی تھی، میری معلومات کے مطابق ۱۹۳۳ میں تعمیر ہونے والے اس شاندار محل میں پوجا پاٹ کیلئے شِو مندر بھی قائم کیا گیا تھا، تاہم اب اس کے آثار کہیں موجود نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مہٹہ پیلس کی تعمیر میں استعمال ہونے والا گلابی پتھر جودھ پور سے خصوصی طور پر منگوایا گیا تھا، بیرونی دیواروں پر نہایت خوبصورتی سے گُل بوٹوں اور پرندوں کی تصاویر تراشی گئی ہیں، سولہ کشادہ کمروں پر مشتمل مہٹہ پیلس کی ایک اور خاص شناخت دلکش گنبد، محرابیں اور مینار ہیں۔ یہ عظیم الشان محل ثقافتی طور پر بھی نہایت دلچسپ تاریخ کا حامل ہے، قیام پاکستان سے قبل رائے بہادر شیو رتن مہٹہ کا شمار کراچی کے امیر ترین ہندو کاروباری افراد میں ہوتا تھا، انکا خاندان کلکتہ سے نقل مکانی کر کے کراچی میں آباد ہوا، رائے بہادر نے جہاز رانی اور جہاز سازی کے شعبے میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتے تھے جو ایک مہلک بیماری میں مبتلا تھی، اس حوالے سے ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ اگر ساحلِ سمندر کے قریب رہائش اختیار کی جائے تو سمندری آب و ہوا سے ان کی صحت میں بہتری آسکتی ہے، یہ جاننے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بیوی کیلئے بحیرہ عرب کے کنارے کراچی میں ایک ایسا خوبصورت اور عظیم الشان محل تعمیر کرائیں گے جس کی مثال پورے خطے میں نہیں ہوگی۔ اور یوں برصغیر کی تاریخ کا ایک ایسا عظیم الشان محل کراچی کے کلفٹن کے ساحل پر مہٹہ پیلس کے نام سے تعمیر ہوا جس میں رہائش پذیر ہو کر جان لیوا بیماری میں مبتلا انکی اہلیہ کی صحت تیزی سے بہتر ہونے لگ گئی۔ رائے بہادر نے اپنی بیوی کی مکمل صحتیابی کی خوشی میں اس پیلس میں ایک عظیم الشان جشن منانے کا فیصلہ کیا تو معزز مہمانانِ گرامی میں کراچی کے پہلے منتخب میئر جمشید وانجی مہتہ سمیت مختلف سماجی معزز شخصیات شامل تھیں۔ رائے بہادر شیو رتن کو اپنی اہلیہ کے ساتھ مہٹہ پیلس میں زیادہ عرصہ گزارنا نصیب نہیں ہوا کہ انگریز کے برصغیر سے جانے کا وقت آ گیا۔ تقسیمِ ہند کا اعلان ہوا تو رائے بہادر مہٹہ کو بھی اپنی اہلیہ سمیت کراچی سے ہجرت کا دُکھ سہنا پڑ گیا۔ نوزائیدہ مملکت پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں امورِ مملکت چلانے کیلئے مہٹہ پیلس میں وزارتِ خارجہ کا دفتر قائم کر دیا گیا جو نئے دارالحکومت اسلام آباد منتقلی تک قائم رہا۔ نیا دارالحکومت بننے کے بعد مہٹہ پیلس کی تاریخ میں ایک اور نمایاں موڑ آیا ہے جب حکومت نے یہ شاندار محل بانی پاکستان کی ہمشیرہ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے حوالے کر دیا، مادر ملت کی نسبت سے اس محل کو قصر فاطمہ بھی کہا جانے لگا، تاہم مادر ملت کی پراسرار موت کے بعد مہٹہ پیلس کی ملکیت کیلئے مقدمہ بازی کا آغاز ہو گیا، لواحقین کی جانب سے دائر کردہ درخواستوں کے فیصلے میں سندھ ہائی کورٹ نے مہٹہ پیلس محترمہ فاطمہ جناح کی بہن شیریں جناح کے حوالے کر دیا، ان کی بہن ۱۹۸۰ء تک یہاں رہائش پذیر رہیں لیکن ان کی وفات کے بعد بھی لواحقین کے تنازعات جاری رہے جس کے باعث مہٹہ پیلس سیل کر دیا گیا۔ عظیم رائے بہادر مہٹہ اور ان کی بیوی کی محبت کی نشانی مہٹہ پیلس لگ بھگ ایک دہائی تک ویرانیوں کا شکار رہا، جہاں کبھی زندگی کی رونقیں عروج پر ہوا کرتی تھیں، وہاں اندھیروں کا راج ہو گیا۔ نوے کی دہائی میں حکومت سندھ کی درخواست پر وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے صوبائی محکمہ ثقافت کو مہٹہ پیلس خرید کر بحال کر کے میوزیم میں تبدیل کرنے کیلئے فنڈز فراہم کئے، عظیم الشان محل کی دیکھ بھال کیلئے ایک خودمختار بورڈ آف ٹرسٹیز بھی قائم کیا گیا، پیلس کو اس کے اصلی رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے سندھ کا ثقافتی میوزیم بنا دیا گیا، ثقافتی سرگرمیوں کے موجودہ مرکز کی آفیشل ویب سائٹ بھی مہٹہ پیلس میوزیم کے نام سے موجود ہے۔ آج عدالت میں جاری مقدمہ بازی کی وجہ سے مہٹہ پیلس ایک مرتبہ پھر خبروں کی زینت بن گیا ہے، اس حوالے سے میرا یہ موقف ہے کہ کسی بھی عمارت یا علاقے کا نام تبدیل کرتے ہوئے اخلاقی اقدار کو بھی پیش نظر رکھا جائے، ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ ماضی میں کراچی کی ترقی و خوشحالی کیلئے مہٹہ خاندان سمیت غیر مسلم کمیونٹی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، تقسیمِ ہند کے بعد بھی انہوں نے کراچی کو خیر باد کہتے ہوئے اپنا محل نیک خواہشات کے ساتھ حکومت پاکستان کے حوالے کیا تھا، ہمیں مہٹہ پیلس جیسے عظیم ثقافتی ورثے کی اصل شناخت برقرار رکھنے کے لئے اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔

شعبہ پاکستان

کراچی کی نیپیئر روڈ کے قحبہ خانے اور کوٹھے کیسے اجڑے؟

تحریر: ریاز سہیل

عید کا دن تھا کچھ نوجوان کراچی کے نیپیئر روڈ میں کھڑے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ چار خوبصورت لڑکیاں انتہائی چست لباس میں سڑک پار کر رہی ہیں جن میں سے ایک نے سر پر دوپٹہ جما رکھا ہے۔ نیپیئر روڈ پر ایسا نظارہ تو معمول کی بات تھی لیکن اتنی دلچسپی کیوں؟ اصل بات یہ تھی کہ ان لڑکیوں میں سے جس نے سر پر دوپٹہ جما رکھا تھا وہ اداکارہ بابرہ شریف تھیں جو اپنی خالہ سے عید ملنے آئی تھیں۔

کراچی کا نیپیئر روڈ شہر کا قدیم بازار حسن یا ریڈ لائٹ ایریا تھا۔ 'اس دشت میں اک شہر تھا' کے مصنف اقبال رحمان مانڈویا مزید لکھتے ہیں کہ بابرہ شریف فلموں میں کامیاب ہو کر لاہور منتقل ہونے سے قبل اسی نیپیئر روڈ پر واقع شمشاد منزل کی دوسری منزل پر رہتی تھیں۔

نیپیئر روڈ پر خستہ حالت عمارتیں اور بالکونیوں یہاں کئی بہاریں دیکھ کر اب بیوگی کا لباس تن کیے ہوئے ہیں جہاں کئی کہانیوں نے جنم لیا اور وہیں دفن ہو گئیں۔ اس محلے کے در و دیوار میں کئی ایسے راز ہیں جو کبھی دہلیز کی دوسری طرف نہیں گئے۔

میں جب اس نیپیئر روڈ پر پہنچا تو ہر کوئی اس کو قصہ ماضی سمجھ کر بھول چکا تھا یا لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے نظر آیا۔ بالآخر سفید ٹوپی پہنے ہوئے ایک بزرگ شخص نے موجودگی کی وجہ پوچھی اور بے اختیار ان کے منھ سے 'ہائے رے' کے الفاظ نکلے۔ فہیم (فرضی نام) نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ سامنے جو عمارت ہے یہاں بابرہ شریف رہتی تھیں اس کے بعد مختلف عمارتوں کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ وہاں فردوس، وہاں زیبا اور نجمہ رہتی تھیں۔ 'اب تو یہ موچی بازار بنا ہوا ہے نہ تو کوئی بائی رہی نہ ہی کوئی خان صاحب، یہ بازار اجڑ چکا ہے۔'

بازار حسن کا قیام: برصغیر یعنی موجودہ انڈیا اور پاکستان میں بازار حسن کی روایت قدیم ہے۔ رخسانہ افتخار جنرل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان میں اپنے مکالے 'کلونیئل ڈیزائر اور رینٹ بیوٹی' میں لکھتی ہیں کہ برطانوی فوجیوں میں جنسی امراض کے بعد ۱۸۶۴ میں جنسی امراض کے پھیلاؤ کی روک تھام کا قانون آیا جس میں ترامیم ہوتی رہیں۔ اس قانون کے تحت جسم فروشی کو قانونی حیثیت اور تحفظ حاصل ہوا۔ اس قانون کے تحت برطانیہ کے زیر انتظام انڈیا میں کنٹومنٹ ایریا میں مخصوص جگہوں پر ریڈ لائیٹ ایریا یا قحبہ خانوں کے قیام کے اجازت نامے جاری کیے گئے۔ رخسانہ افتخار کے مطابق اس دھندے میں ملوث خواتین کے جسمانی معائنے اور پولیس کو کسی جسمانی بیماری کا شکار خواتین کی گرفتاری کا بھی اختیار دیا گیا، اس قانون کا مقصد برطانوی فوج کے سپاہیوں کو سہولت فراہم کرنا تھا جو اپنے ملک سے دور دراز کے علاقوں میں تعینات تھے۔ اس تحقیقی مکالے سے فحاشی کے اڈوں میں یورپی خواتین کی موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے، جس کے مطابق ۱۹۱۰ میں ۳۰۰ سے ۳۵۰ یورپی خواتین جسم فروشی کے کاروبار میں شامل تھیں۔ کلکتہ، بمبئی، رنگون، کچھ تعداد میں کراچی میں وہ اپنے دلالوں کے ذریعے یہ کاروبار چلاتی تھیں۔

عالمی جنگیں اور کراچی کی معشیت: جنگ عظیم اول اور دوئم کے کراچی کی معشیت پر مثبت نتائج مرتب ہوئے اور یہاں پیسے کی ریل پیل ہوئی، 'کراچی ملکہ مشرق' کی مصنفہ محمودہ رضویہ لکھتی ہیں کہ '۱۹۱۴ میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی اور کراچی کو فوجی نقل و حرکت کا مرکز قرار دیا گیا۔ یہاں سے افواج خلیج فارس اور عراق میں آسانی سے پہنچ سکتی تھیں، یہاں ہر قسم کی جنگی ضروریات کے تحت ادارے اور دفاتر کھولے گئے جس کے باعث کراچی کی آبادی پچاس فیصد تک بڑھ گئی۔ مکانات اور دکانوں کی قلت ہونے لگی کئی عمارتیں بنیں، جنگ کے چار برس کے دوران میں یہاں کے تاجروں نے لاکھوں روپے کمائے۔' اس دور میں راجستھان، ممبئی اور گوا سے سیلاوٹ، پارسی اور گونز کمیونٹی کے لوگ یہاں نقل مکانی کر کے آئے اور یہاں کی معشیت میں مددگار ثابت ہوئے۔

نیپیئر روڈ کا حسن: سر چارلس نیپیئر کی سربراہی میں تاج برطانیہ نے سندھ پر قبضہ کیا تھا۔ انھوں نے ہی سندھ کا دارالحکومت حیدرآباد سے کراچی منتقل کیا، بندر روڈ سے لی مارکیٹ تک کی سڑک ان کے نام سے منسوب کی گئی تھی۔ کراچی میونسپل نے نیپیئر روڈ کا ریڈ لائٹ ایریا کے لیے کیوں انتخاب کیا؟ اس سوال کے جواب میں 'اس دشت میں اک شہر تھا' کے مصنف اقبال رحمان مانڈویا لکھتے ہیں کہ اس بازار کے گاہک مسافر ہوتے ہیں یہ علاقہ بندرگاہ سے نزدیک تر ہونے کی بنا پر شپ کریو اور غیر ملکی مسافروں کے لیے پرکشش تھا، اسی طرح سٹی ریلوے سیشن سے نزدیک تر ہونے کے باعث یہ علاقہ، اندرون ملک کے مسافروں کے لیے بھی پسندیدہ تھا۔ بلوچستان و ایران سے آنے والی بسوں کا اڈہ بھی نزدیک تھا سو سب اطراف میں بے شمار رہائشی ہوٹل تھے یوں یہ علاقہ بازار حسن کے لیے مناسب قرار پایا۔ تمام تر قانونی تحفظ کے ساتھ یہ بازار حسن بھی ہندوستان میں قدیم زمانے سے فن، آداب اور روایات کے سائے تلے پروان چڑھا جہاں رقص اور موسیقی کی دنیا پوری آب و تاب سے قائم ہوئی اور ساتھ قحبہ خانے بھی چلے۔

بازار حسن، فلمی صنعت کی نرسری: قیام پاکستان کے بعد نیپیئر روڈ سمیت کئی بازار حسن نو مولود اسلامی ریاست کو ورثے میں ملے۔ 'اس دشت میں اک شہر تھا' کے مصنف اقبال رحمان مانڈویا لکھتے ہیں کہ کبھی ان کی سرپرستی اس دور کے نواب اور راجہ کرتے تھے مگر قیام پاکستان کے بعد جب نوابوں اور راجاؤں کی راج دہانیاں ختم ہو گئیں تو نیپیئر روڈ کا علاقہ

کراچی میں بننے والی فلموں کے لیے فنکار تیار کرنے کی نرسری بن گیا۔ یہاں قحبہ خانے اور کوٹھے مختلف معیار کے تھے، تماش بین کس قدر مہذب اور خوش ذوق تھے اسی اعتبار سے یہاں مختلف کوٹھوں پر مجرا ہوتا تھا۔ جب سرِشام اطراف کی مارکیٹیں بند ہونے کی تیاری میں ہوتیں تو یہاں زندگی میں بیداری کی لہر آتی اور بالاخانوں سے آتی گھنگھروں کی چھناچھن کا ہلکا پھلکا آغاز ہوتا اور جوں جوں چاند بلند ہوتا اس مارکیٹ کی رونق کو ایک کے بعد ایک چاند لگتا جاتا۔ گھنگھروں کی چھناچھن بڑھتی بالکونیوں کے در کھلتے اور مجرے سے قبل کی ریہرسل شروع ہوجاتی جو دراصل تماش بینوں کو متوجہ کرنے کا ایک انداز ہوتا، کہیں کہیں رقاصہ رقص کرتی گھنگھروں کی چھناچھن بکھیرتی بالکونی میں آجاتی۔

ہار، گجرے اور کرارے نوٹ: نیپیئر روڈ پر اس وقت چپلوں، چینی دندان ساز، حکمت کی دواؤں سمیت متعدد دکانیں ہیں، ایک قدیم پان شاپ والے احمد (فرضی نام) کا کہنا ہے کہ یہاں میوزک سینٹر اور گھڑیوں کی دکانیں بھی ہوتی تھیں، بازار کی خواتین کلائی پر گھڑیاں پسند کرتی تھیں۔ اقبال رحمان مانڈویا لکھتے ہیں کہ 'رات دس بجے تک پورا علاقہ روشنی کی چکاچوند سے جگمگانے لگتا، ہار گجرے کی دکانیں اور ہاتھ میں مالا بیچتے لڑکے سب فعال ہو جاتے۔' یہ سارا تماشہ روپے پیسے سے منسلک ہوتا لہٰذا اس بازار کی ایک روایت بڑی دلچسپ ہے۔ مجرے میں جو بھی رقم نذر یا نچھاور کی جاتی وہ ہمیشہ نئے کرارے نوٹ کی صورت میں ہوتی، جو یہاں کے مستقل شائق ہوتے وہ نئے کرارے نوٹوں کا انتظام کرکے آتے اور جو نہ کرپاتے ان کے لیے بازار ہی میں پھولوں اور گجرے والوں کے پاس نئے نوٹ دستیاب ہوتے، آخری حربے کے طور پر کوٹھے کی نائکہ بھی اس کا انتظام کر رکھتی۔ روزانہ نچھاور کیے جانے والے نئے نوٹوں کی گڈیاں ان کی معرفت دوبارہ استعمال ہوتی رہتی۔

'آؤٹ آف باؤنڈ ایریا': نیپیئر روڈ کا یہ بازار نابالغوں کے علاوہ فورسز کے اہلکاروں کے لیے بھی ممنوع علاقہ تھا۔ کراچی کی تاریخ و مقامات پر کتاب 'ایسا تھا میرا کراچی' کے مصنف محمد سعید جاوید لکھتے ہیں کہ شام ڈھلے گلی کے باہر نمایاں جگہ پر ایک چھوٹا سا بورڈ رکھ دیا جاتا تھا جس پر 'آؤٹ آف باؤنڈ ایریا' لکھا ہوتا تھا جس کا مطلب عام فہم میں یہ تھا کہ یہاں مسلح افواج کے علاوہ دوسرے سرکاری ملازمین کا داخلہ ممنوع ہے۔ البتہ وہاں سادہ لباس میں ہر وقت پھرتے ہوئے پولیس کے اہلکار ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتے تھے۔

اقبال رحمان مانڈویا لکھتے ہیں کہ سکیورٹی فورسز کا انٹیلیجنس نظام اس بازار میں متحرک رہتا تھا تاکہ فورسز کے اہلکاروں کو اس بازار سے دور رکھا جائے اگر کوئی رنگروٹ یا اہلکار اس بازار میں نظر آجائے تو اس کی اطلاع اوپر ہوجاتی تھی اور فوری طور پر ایک نظام حرکت میں آجاتا۔

سیٹو سینٹو اور بازار حسن: پاکستان جب ۱۹۶۰ کی دہائی میں بین الاقوامی اتحادی افواج کے ساتھ سیٹو سینٹو کا رکن بنا تو ایک بار پھر غیر ملکی جنگی بیڑے اور فوجیوں نے یہاں کا رخ کیا اور یہ بازار چمک اٹھا۔ 'ایسا تھا میرا کراچی' کے مصنف محمد سعید جاوید لکھتے ہیں کہ جن دنوں کیماڑی کی بندرگاہ پر غیر ملکی نیوی کے جہاز لنگر انداز ہوتے تھے تو ان کے ملاح اور ملازم ٹولیوں کی صورت میں باہر نکلتے تھے، ان کے پیسے کی ریل پیل ہوتی اور وہ گولی کی طرح سیدھے یہاں (نیپیئر روڈ) پہنچتے تھے جہاں نیچے بنے مئے خانوں میں شراب اور اوپر سجے کوٹھوں اور قحبہ خانوں میں شباب ان کو میسر ہوتے۔ مصنف کے مطابق حکومت اس کاروبار میں مداخلت نہیں کرتی تھی بلکہ غیر ملکیوں کے وہاں تک داخلے اور واپسی کے عمل کو ممکن اور سہل بناتی تھی، علی الصبح تک وہاں بگھیاں ان مہمانوں کی منتظر رہتی تھیں۔ 'ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں جب ماحول قدرے آزاد تھا، کراچی میں بڑی تعداد میں غیر ملکی سیاح اور خصوصاً امریکی، برطانوی اور دوسرے ملکوں کے نیوی کے ملاح جن کے بحری جہاز مختصر عرصے کے لیے کراچی کی بندرگاہ پر رکتے وہ یہاں کا رخ کرتے تھے۔'

قحبہ خانے اور کھوٹے ویران کب ہوئے؟: نیپیئر روڈ کے پان شاپ کے مالک احمد نے کیبن کے ساتھ واقع ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ 'یہ پرانا ہوٹل ہے اس میں ڈانس کی محفلیں ہوتی تھیں۔' روڈ کی دوسری جانب ایک تین منزلہ ہوٹل کی طرف سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ 'یہاں بھی محفل سجتی تھی، سب کے پاس اجازت نامہ ہوتا، کوئی غیر قانونی عمل نہیں تھا۔' انھوں نے بتایا کہ 'جنرل ضیاالحق کی حکومت کے بعد تبدیلی آئی پہلے رات نو سے ۱۲ بجے کا وقت مقرر کیا گیا اس کے بعد یہ سلسلہ ہی بند کر دیا گیا ورنہ ۲۴ گھنٹے یہ بازار آباد رہتا تھا۔' 'اس دشت میں اک شہر تھا' کے مصنف اقبال رحمان مانڈویا کا خیال ہے کہ یہ بازار کئی مرتبہ زبوں حالی کا شکار ہوا وہ لکھتے ہیں کہ جب کراچی کی فلم انڈسٹری ختم ہوئی تو یہاں کی انڈسٹری سے روزی روٹی کمانے والے بہت سارے خاندان لاہور منتقل ہوگئے جس کے سبب بازار کی چہل پہل میں فرق پڑا۔ دوسرا اس وقت جب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے تحریک نفاذ مصطفی کے دباؤ میں آکر ملک میں نائٹ کلب، ریس کورس اور جوا خانے بند کر دیے تو اس بازار پر بھی ضرب پڑی، اس کے بعد کے دور میں اسلامی ذہن رکھنے والے جنرل ضیاالحق نے اس بازار پر ایسی ایسی پابندیاں لگائیں اور آنے والے تماشائیوں کو پولیس نے اتنا ہراساں کیا کہ یہ بازار واقعی اجڑ گیا اس بازار میں ۲۰۰ سے زائد گھرانے تھے جو سکڑ کے ۲۵ سے ۳۰ رہ گئے تھے۔

محفل نہیں اب کھپ ہوتی ہے': نیپیئر روڈ کی عمارتوں کے نام بھی دلکش تھے، جیسے بلبل ہزار داستان، جمیلہ شکیلہ بلڈنگ، شمشاد منزل، سنگیت محل، فنکار محل، موسیقی محل لیکن اب یہ تمام خاموش ہیں، بلبل ہزار داستان سمیت کچھ کی تعمیر نو کی گئی ہے۔ بلبل ہزار داستان کے داخلی راستے اور اس کے عقب میں واقع عمارت میں اب بھی کچھ خواتین نظر آتی ہیں جو بات کرنا پسند نہیں کرتیں۔ نعیم نے بتایا کہ 'ایک ٹی وی چینل نے یہاں چھاپہ مار کر لڑکیوں کی ویڈیوز بنائیں اس کے بعد پولیس ان کے پیچھے پڑ گئی حالانکہ یہاں سے لڑکیاں اب اسٹیج اور نجی محفلوں میں پرفارمنس کے لیے جاتی ہیں۔' نیپیئر روڈ کا آخری سکینڈل شاید سنہ ۲۰۰۰ میں سامنے آیا تھا، جب فاخرہ نامی ایک لڑکی پر تیزاب پھینکا گیا تھا۔ اس مقدمے میں غلام مصطفی کھر کے بیٹے بلال کھر کو نامزد کیا گیا تھا، جس نے ضمانت کروالی تھی، جبکہ فاخرہ کے متعدد آپریشنز کیے گئے لیکن اس کا چہرہ ٹھیک نہیں ہوا اور واقعے کے تقریباً دس برس بعد اخبارات میں اس کی خودکشی کی خبر آئی تھی۔

نگار سینیما چوک سے اگلے چوک پر امام بارگاہ کے قریب طبلے کی مرمت اور فروخت کرنے والوں کی دکانیں ہیں، جن میں سے کئی جانتے تو بہت کچھ ہیں لیکن بتانا نہیں چاہتے۔ وقار نامی ایک طبلہ مستری کا صرف اتنا کہنا تھا کہ 'اب محفل کہاں اب تو صرف کھپ ہوتی ہے۔'

یہ قبرستان سیدوں کا ہے

تحریر: اویس توحید

دریائے سندھ کے کنارے آباد ایک قدیم قصبہ سن ہے، جہاں اس روز ہزاروں کا مجمع تھا۔ نوجوان، بوڑھے، ادھ ننگے، پیر، غریب، ہاری سبھی تھے۔ خوشبو والے بوسکی کے لباس اور پجیرو گاڑیوں میں امیر وڈیروں کا بھی ایک ہجوم تھا۔

ہر طرف لال رنگ کے جھنڈے لہرا رہے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس قصبے نے گویا رنگ برنگی سندھی ٹوپیوں اور اجرک کی چادر اوڑھ لی ہو۔ ”تنجھو سائیں، منجھو سائیں، جی ایم سائیں، جی ایم سائیں، تنجھو رہبر، منجھو رہبر، جی ایم سید، جی ایم سید“۔ کالجوں اور یونیورسٹی کے جذباتی طالب علم فضا میں نعرے بلند کر کے اپنے رہنما کو خراج عقیدت پیش کر کے دنیا سے رخصت کر رہے تھے۔ جہاں ان کے چاہنے والے سندھ میں پروگریسیو اور قوم پرست سیاست کا بانی سمجھتے ہیں تو ناقدین انہیں ”غدار“ جیسے القابات سے پکارتے رہے ہیں۔ اس روز ان ”سیاسی چیلوں“ نے اپنے روحانی پیشوا کے جنازے میں قرآن شریف کی تلاوت کے ساتھ دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں گیتا، توریت، بائبل سے اقتباسات پڑھے، جو بقول ان کے جی ایم سید کی دوسرے مذاہب سے عقیدت کی عکاسی تھی۔

ان کے آبائی قبرستان حیدر شاہ سنائی میں تدفین کے وقت درخت کے ساتھ ایک شخص سسکیوں سے رو رہا تھا۔ جنازے میں موجود غالباً ہر شخص کا شناسا اور جی ایم سید کا خادم خاص، اس نے ساری زندگی ان کے ساتھ ہی بتائی تھی۔ نظر بندی ہو یا سندھ کے سیاسی دورے یا نوجوانوں سے ”سائیں“ کی کچہریاں، وہ ہمیشہ ساتھ ہی نظر آتا۔ نام ماسٹر غلام قادر، ذات کا ملاح۔ بتایا جاتا ہے کہ جی ایم سید کے سوئم کے روز ماسٹر غلام قادر ملاح بھی دنیا سے رخصت ہوا۔

ستم ظریفی دیکھیے پچیس چھبیس برس بعد جی ایم سید کا خانوادہ اور ماسٹر غلام قادر کی ملاح برادری ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں۔ قضیہ اسی حیدر شاہ سنائی قبرستان کا ہے، جہاں جی ایم سید اور ان کا چہیتا غلام قادر ملاح دفن ہیں۔

ملاح برادری، جو اس قصبے میں صدیوں سے آباد ہے اور روایتی طور پر جی ایم سید کی قوم پرست سیاست کی حامی رہی ہے لیکن ان دنوں سراپا احتجاج ہے۔ یہاں کے باسی واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ گزشتہ ماہ قبرستان میں مقامی میونسپل کمیٹی کے اہلکاروں کی غیر معمولی حرکات وسکنات دیکھی گئیں۔ ابتدا میں احساس ہوا کہ شاید قبرستان میں کوئی مرمت یا صفائی وغیرہ ہو رہی ہو گی۔ لیکن جب مقامی ملاح برادری کے کچھ افراد قبرستان میں اپنے عزیزوں کی قبروں پر حاضری دینے گئے تو کہرام سا مچ گیا، لگ بھگ بارہ قبریں کھدی پڑی تھیں۔

پتا چلا کہ سید ظفر شاہ، جو جی ایم سید کے پوتے ہیں، یہ کارروائی ان کے حکم پر ہوئی ہے۔ ملاح برادری کی قبروں سے باقیات نکالی گئیں اور دوسری جگہ اجتماعی طور پر منتقل کر دی گئیں۔

بقول ایک ملاح کے، ”ہم نے احتجاج کیا تو ظفر شاہ نے کہا کہ یہ قبرستان سیدوں کا ہے۔ ہماری مستورات دفن ہیں۔ ملاحوں کی قبروں سے بے حرمتی ہوتی ہے۔“ ابتدا میں اس واقعے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی لیکن ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ معاملہ اتنی سنگینی اختیار کر گیا کہ سندھ کی مذہبی رواداری اور بھائی چارے کے سماجی تشخص کو ہلا کر رکھ دیا۔ سندھ کے انسانی حقوق کے علمبردار رہنما، دانشور اور معروف لکھاری، جن میں نور الہدیٰ شاہ، جامی چانڈیو، امر سندھو اور عطیہ داؤد شامل ہیں، معاشرے میں اس ”غیر انسانی اور وحشیانہ عمل“ کے خلاف احتجاج پر چار کر رہے ہیں۔ چند برس قبل بدین میں انتہا پسندوں کے جتھوں نے قبرستان سے ایک شخص بھورو بھیل کی لاش کو نکال کر پھینک دیا تھا۔ انتہا پسندوں کی نظروں میں قصور بھورو بھیل کا تھا۔ ہندو اور وہ بھی دلت، کیسے مسلمانوں کے قبرستان کے احاطے میں دفنایا گیا؟ لیکن سیاسی، قوم پرست جماعتوں اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے یک زباں ہو کر واقعے کی مذمت کی اور ہندو برادری کے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس وقت اس رجحان کو سندھ سے

جذباتی لگاؤ رکھنے والی بعض شخصیات نے "غیر فطری اور سندھ دھرتی پر اجنبی ثقافت تھوپنے" کی سازش گردانا تھا۔

سندھ صوفیوں کی سرزمین ہے۔ دھرتی پر انتہاپسندانہ سوچ کا غلبہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم نے تو بچپن سے اس دھرتی پر ہندو مسلمان یکتا دیکھی ہے۔ ہولی ہو یا دیوالی یا پھر عید کا تہوار، ہم نے تحائف کا تبادلہ ہوتے دیکھا ہے۔ لیکن ماضی میں انتہاپسندی کے جو بیج بوئے گئے تھے، وہ اب تناور درختوں میں تبدیل ہو رہے ہیں اور سندھ کی سرزمین میں پھیلی اس کی جڑیں اب دھرتی کی صوفی شناخت کو کھوکھلا کر رہی ہیں اور ہم ماضی کے رومانس میں شاید مدہوش ہی رہنا چاہتے ہیں۔ سندھ میں انسانی حقوق کی سرکردہ رہنما عرفانہ ملاح کہتی ہیں کہ ریت میں شتر مرغ کی طرح سر چھپانے سے سندھ میں تلخ حقیقتوں کی تبدیلیوں سے منہ نہیں موڑا نہیں جاسکتا اور بڑھتی ہوئی انتہاپسندی، ذات پات کی سماجی تفریق سندھ کی دھرتی کے لیے ناسور کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ پہلے وڈیروں کی سیاسی راجدھانیوں نے سیاسی گھٹن کا ماحول پیدا کیا اور اب ذات پات کی بنیاد پر سماجی تقسیم کی راجدھانیاں بنا کر دھرتی کے تشخص کو مسخ کیا جارہا ہے۔ وہ کہتی ہیں، "سید شخصیت جیسی بھی ہو، ذات کی اعلی وارفع ہے اور میں ڈاکٹریٹ کرکے بھی نچلی ذات کیونکہ میں ملاح ہوں۔ میری برادری کے پرکھوں کی قبریں بھی قبرستان میں قبول نہیں۔ سندھ میں قبرستان بھی اب سیدوں کے الگ ہونے لگے ہیں، تو یہ ہمیں اپنی دھرتی پر قبول نہیں۔"

سید برادری کے ذمہ داران اس "انفرادی عمل" کو برادری کے خلاف سوچی سمجھی سازش مانتے ہیں اور اس واقعے کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو برادری کو بدنام کرنے کا ذمہ دار سمجھ رہے ہیں۔ میری خود پرورش سندھ کے معاشرے میں ہی ہوئی ہے۔ اس معاشرے میں سیدوں کا درجہ اعلیٰ ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ پہلے تو سید خاندانوں کی شادی بیاہ صرف اپنی ہی ذات سے تعلق رکھنے والے خاندانوں تک محدود تھے۔ بدلتے وقت کے ساتھ پھر دوسری ذات کے خاندانوں کی لڑکیوں کے ساتھ بیاہ کرنے کی مثالیں بھی دیکھی گئیں۔

لیکن اب بھی اگر سید خاندان کی لڑکی کسی دوسری ذات کے لڑکے کے ساتھ شادی کرنا چاہے تو اکثر اسے سماج بدر کردیا جاتا ہے یا پھر خاندانی ناراضی برسوں جاری رہتی ہے۔ پرانے زمانے میں سید خاندانوں کی لڑکیوں کو "قرآن سے شادی" کی رسم کے ذریعے اپنے فرسودہ رسم و رواج پر قربان کردیا جاتا تھا۔ سندھ کے شاعر اور صحافی اشفاق آذر ایک قصہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں، "شکارپور میں ہمارے محلے کے ایک سید خاندان کی چار لڑکیاں تھیں۔ اب وہ بوڑھی ہوگئی ہیں لیکن اسی فرسودہ رواج کی وجہ سے ان کی شادیاں نہیں ہوسکیں۔ وہ اب بابرکت بیبیاں سمجھی جاتی ہیں۔ محلے، پڑوس کے لوگ ان سے فال نکلواتے ہیں اور اپنی قسمت بدلوانے کی دعائیں لیتے ہیں۔"

قرآن سے شادی کی رسم کو جدید دور میں محقق چیلنج کرتے ہیں اور اسے دراصل حق معاف کروانے کی رسم مانتے ہیں۔ جب سید خاندان میں لڑکی کا رشتہ نہ مل رہا ہو تو لڑکی کو اس رسم کی زنجیروں سے جکڑ دیا جاتا ہے۔ رسم کی رو سے سید خاندان کی وہ لڑکیاں اپنے شادی اور خاندان کی جائیداد اور زمین میں حصے کے حق کو معاف کردیتی ہیں اور اپنی حویلیوں میں پوری زندگی کی قید کاٹتے ہوئے موت کی گھڑیاں گنتی رہتی ہیں۔

سید اپنی ذات کی نسبت کو حضور پاک کے خاندان سے جوڑتے ہیں اور معاشرے میں اعلی درجہ حاصل کرتے ہیں۔ ان کی سندھ میں آمد محمد بن قاسم کے دور میں بتائی جاتی ہے لیکن کچھ روایتوں کے مطابق اس سلسلے کا آغاز کربلا کے واقعے کے بعد ہوا۔ سندھ معاشرہ، جس کی بنیادوں میں صوفی ثقافت رچی بسی ہے، وہاں سیدوں کو انتہائی احترام اور عزت کا مقام حاصل ہوا۔ دھیرے دھیرے بااثر سید خاندانوں نے معاشرے میں حاصل شدہ حقوق کے ساتھ ساتھ سیاسی اجارہ داری بھی حاصل کی۔ مخدوم ہوں یا پیر، جو گوٹھ کے پیر پگارا ہوں یا سکھر کے خورشید شاہ، خیرپور کے سید قائم علیشاہ ہوں یا شاہ رکن عالم کے گدی نشین شاہ محمود قریشی، سب ہی انتخابات کے دوران سندھ میں ووٹوں کے حصول کی جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اسمبلی کے اراکین کے ناموں کے ساتھ سید اور شاہ اتنے ہیں کہ گنتے گنتے سانس پھول جائے۔

جی ایم سید کا خانوادہ بھی سیاسی اجارہ داری کی تلاش میں ہے لیکن ہمیشہ ناکام ہی رہا۔ سید ظفر شاہ، جنہیں ملاح برادری کے بزرگوں کی قبروں کی بے حرمتی کا ذمہ دار سمجھا جارہا ہے، وہاں ان کا سوشل میڈیا پر چند جملوں کا پیغام ہے کہ انہیں افسوس ہوا ہے۔ لیکن کیا یہ کافی ہے؟ جی ایم سید کے نام کے ساتھ جی رہے ہیں، ان کے فلسفہ پر داغ لگایا ہے، جو شاید مٹائے نہ مٹ سکے۔ چند برس قبل اپنے دوستوں جامی چانڈیو اور ناز سہتو کے ساتھ تھر کے صحرا سے لاڑکانہ، سکھر اور گھوٹکی تک کیا سفر یاد آرہا ہے۔ شاہ لطیف بھٹائی کی درگاہ میں میں ان کا ہندو فقیر واگند دفن ہے۔ ناز سہتو نے بھٹائی کے اپنے ہندو فقیر کیلئے "بلاول" سر میں کہے کلام کے اشعار سنائے۔ سچل سرمست کی درگاہ پہنچے تو اسی احاطہ میں ان کی ہندو فقیر "نماڑو" اور مرید نندنی شیوک رام کی قبریں بھی موجود ہیں۔

ہم دوست ماضی کے مذہبی رواداری کے گہوارے سندھ کی ثقافت کی یادوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ فقیر صوفی کلام گانے میں مصروف تھے۔ جب ہم درگاہ سے نکلے اور پیچھے نظر ڈالی تو خیال آیا کہ کہیں یہ روایتیں صرف سندھ کی رومانوی تاریخ کے پنوں ہی میں نہ بند ہوجائیں۔ دل میں ایک انجانا سا خوف تھا کہ کہیں بڑھتی ہوئی انتہاپسندی کا بھنور سندھ کی ثقافت کو ہی نہ نگل جائے، کہیں یہ سیلاب ہماری سنہری یادوں کو ہی بہا کر نہ لے جائے۔

❀❀❀

احکام اسلام کی افادیت

(ثاقب زیروی کی یادیں)

غالباً ۱۶ ستمبر ۱۹۴۸ء کو حضرت مولانا جلال الدین شمس نورہ اللہ مرقدہ نے ''مشاورتی مجلس'' میں جماعت ہائے احمدیہ پاکستان کے نئے مرکز کا نام ربوہ تجویز کیا جس کے بعد ۲۵ ستمبر کو امام جماعت احمدیہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کی قیادت میں اکابر جماعت کے ایک قافلہ نے ربوہ کا افتتاحی دورہ کیا جس کے چند ہفتے بعد ربوہ ہی میں حضور نے پریس کانفرنس سے خطاب فرمایا جس میں درج ذیل مقتدر صحافیوں نے شرکت کی۔

مولانا عبدالمجید سالک مدیر انقلاب، فیض احمد فیض ایڈیٹر پاکستان ٹائمز، باری علیگ بی آئی ایس، عبداللہ بٹ (برٹش انفارمیشن سروس)، جمیل الزمان (سول اینڈ ملٹری گزٹ)، صدیقی صاحب نمائندہ سٹار، میاں محمد شفیع (عرف م۔ش)، پروفیسر محمد سرور (ہفتہ وار آفاق)، بشیر احمد (سفینہ)، صالح محمد صدیق (مغربی پاکستان) اور سردار فضلی (روزنامہ احسان) وغیرہم۔ انہی دنوں میں گورنر پنجاب سر فرانسس موڈی نے جوہر آباد کا سنگِ بنیاد رکھا۔

لاہور میں انہی دنوں قندیل اور چٹان کے علاوہ ایک بڑا ہی ثقہ ہفت نامہ آفاق بھی شائع ہوتا تھا جو سنجیدہ حلقوں میں کافی معروف و مقبول تھا۔ اس کے ادارہ تحریر میں پروفیسر سرور جامعی، میاں محمد شفیع (م۔ش) اور چوہدری علی محمد خادم شامل تھے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم اس میں ہفتہ وار ڈائری لکھا کرتے تھے۔ اپنی ایک ڈائری میں انہوں نے لکھا کہ: ''گزشتہ ہفتہ جوہر آباد کا سنگ بنیاد گورنر موڈی نے رکھا ہے اور انہی دنوں میں مرزا بشیر الدین محمود احمد نے جماعت ہائے احمدیہ پاکستان کے نئے مرکز کا افتتاح کیا ہے۔ دیکھیں ان دونوں شہروں میں سے کون سا پہلا آباد ہوتا ہے۔''

حضور کی نگاہوں سے یہ ڈائری گزری تو مجھے بلوایا اور فرمایا۔ ''ابھی جا کر تاثیر صاحب سے کہہ آؤ کہ ربوہ پہلے آباد ہوگا'' اور ہوا بھی۔ چند ہی دنوں میں وہاں کچے دفاتر اور مکانوں کی تعمیر شروع ہوگئی اور چند ہی ماہ میں تمام مرکزی دفاتر اور جماعت کے امام تک ان کچے مکانوں میں منتقل ہوگئے اور اب تو بفضلہ تعالیٰ ربوہ ایک پختہ شہر ہے اس میں جابجا سایہ دار اور پھلدار درخت ہیں۔ سبزہ بنجر قدیم زمین کے کلر کو کھا گیا ہے ایک عظیم ہسپتال ہے ریلوے سٹیشن ہے، تھانہ ہے، ٹاؤن کمیٹی ہے اور ریذیڈنٹ مجسٹریٹ بھی، لڑکوں اور لڑکیوں کے کالج اور ہائی سکول ہیں، ایک وسیع و عریض ''دار الضیافت'' کے علاوہ پانچ فائیو سٹار ہوٹلوں جیسے مہمان خانے ہیں عظیم الشان خلافت لائبریری ہے، نیز صدر انجمن احمدیہ اور تحریک جدید کے سیکرٹریٹ ہیں۔ بیرونی ممالک کے لئے مبلغین تیار کرنے کا تعلیمی ادارہ جامعہ احمدیہ ہے۔ دسیوں تعلیمی و تربیتی ادارے ہیں۔ ربوہ سے روزنامہ الفضل کے علاوہ ماہنامہ خالد، ماہنامہ انصار اللہ، ماہنامہ مصباح، ماہنامہ تشحیذ الاذہان اور ماہنامہ تحریک جدید شائع ہوتے ہیں نیز عالمگیر جماعت احمدیہ مرکز ہونے کی وجہ سے ربوہ کو بین الاقوامی نوعیت کی شہرت و عظمت حاصل ہے۔

ہفتہ وار آفاق کا ذکر چھڑا ہے تو شاید یہ بات بے محل نہ ہو کہ ایک دن جناب م۔ش نے مجھ سے ''آفاق'' کی امداد کے لئے کہا تو مَیں نے عرض کیا کہ

''ایسا دو ہی طریقوں سے ہوسکتا ہے، اوّل یہ کہ میں گاہے گاہے اس کے لئے مضمون لکھا کروں۔ جو لکھتا رہتا ہوں دوسرے یہ کہ اپنے حلقہ احباب میں اس کی خریداری کی تلقین کروں جس کے لئے تیار ہوں اور کرتا بھی رہتا ہوں۔''

''رہی بات جماعت کی! اوّل تو ایک مذہبی جماعت کو ایک سیاسی پرچے سے کیا رغبت ہوسکتی ہے۔ ویسے بھی لُٹی کھٹی جماعت پر ایک بھرے شہر کی آبادی و آباد کاری کا بوجھ اور سربراہ جماعت کی ساری توجہ ان دنوں ربوہ آباد کرنے پر مرتکز ہے۔''

اس کے بعد ربوہ کی آبادی و آباد کاری کی باتیں ہوتی رہیں جن کے آخر میں طے پایا کہ مَیں وقت لے لوں تو کسی دن امام جماعت احمدیہ کی خدمت میں حاضر ہوا جائے۔ ربوہ ہی کے بارے میں چند وضاحتیں مطلوب ہیں چنانچہ مقررہ دن کو ہم شام کے وقت ربوہ پہنچ گئے پروفیسر سرور جامعی، جناب م۔ش اور مَیں حضور کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کھانے پر ملاقات ہوگی لاہور سے ربوہ تک کے سفر میں اپنے دونوں ہمسفروں سے مَیں بیرونی مشنوں کی ورکنگ اور ''تحریک جدید'' کے مطالبات کے بارے میں گفتگو کرتا آیا تھا کہ تحریک جدید نے ساری جماعت کی زندگیوں کا رُخ سادہ زندگی، سادہ لباس اور سادہ خوراک کی طرف موڑ دیا ہے۔ رات کو کھانے پر حاضر ہوئے۔ فرشی دسترخوان بچھا مگر میرے دونوں ساتھی یہ دیکھ کر حیران ہوگئے کہ دسترخوان پر دو میٹھی ڈشوں کے علاوہ چار سالن اُتارے گئے۔ جب کہ مَیں راستے بھر انہیں یہ بتاتا آیا تھا کہ ہم اکثر و بیشتر صرف ایک ہی سالن پر اکتفا کرتے ہیں سوائے اس کے کہ کوئی ایسا مہمان آجائے جس کے لئے کچھ تکلّف کرنا پڑے۔ ایسی صورت میں میٹھی ڈش کی بھی اجازت ہے۔ دسترخوان پر نگاہ ڈالتے ہی پروفیسر صاحب نے م۔ش کو اور م۔ش صاحب نے میری طرف دیکھا اُن نگاہوں سے جو کہہ رہی تھیں۔ جناب یہ کیا ہے؟ آپ تو راستے بھر ایک کھانے کا ذکر کرتے آئے ہیں اور یہاں چار چار سالن دسترخوان پر موجود ہیں کیا ''تحریک جدید'' کے مطالبات آپ کے امام پر لاگو نہیں ہیں؟

شاید حضور نے ہمارا یہ ایک دوسرے کی طرف طنز بھری نگاہوں سے دیکھنا بھانپ لیا تھا مگر چپ رہے۔ کھانا ختم ہونے کے بعد جب مختلف باتیں شروع ہوئیں تو حضور نے باتوں باتوں میں فرمایا: ''اسلام کا ہر حکم اپنے اندر ایک خاص اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔

(تجربات جو ہیں امانت حیات کی صفحہ ۱۶۳ تا ۱۶۶)

❁❁❁

ارتقاء اور ڈارون

تحریر: ڈاکٹر دلدار احمد علوی

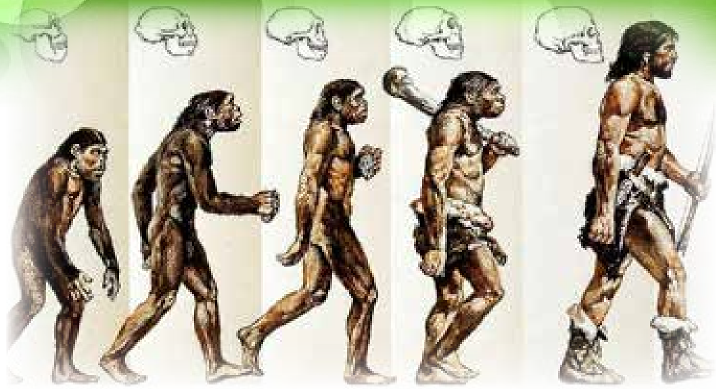

قرآن، سائنس اور انسان۔نظریہ ارتقاء: حقیقت کیا ہے؟

ارتقاء کیا ہے، اس کے نظریات کیا ہیں؟ کیا ارتقاء اور ڈارونزم ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں؟ ''ڈارون بولا بوزنا ہوں میں'' (اکبر الہ آبادی) کی حقیقت کیا ہے؟

''ارتقاء'' عربی زبان کا لفظ ہے جو ''ترقی'' کے مادے سے نکلا ہے۔ ارتقاء کا مفہوم درجہ بدرجہ اوپر چڑھنے اور ترقی پانے کا ہے۔ یہ انگریزی کے لفظ Evolution کا ترجمہ ہے۔ Evolution لاطینی زبان کے لفظ ''Evolutio'' سے بنا ہے جس کے معنی کسی لپٹی ہوئی چیز کو کھولنا ہے۔

"The Latin evolutio means to unroll..." (Peter J. Bowler, P.8)

چنانچہ، لفظ Evolution کا اطلاق تبدیلی کے مختلف پہلوؤں پر کیا جاتا رہا ہے۔ حیاتیات (بیالوجی) میں اس کو پہلے پہل رحم مادر میں جنین کی نشوونما کے معنوں میں استعمال کیا گیا (ایضاً، صفحہ ۸)۔ جدید دور میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے (مثلاً دیکھئے انگریزی کی کوئی سی بھی اچھی ڈکشنری)۔ لیکن حیاتیات میں اس کا استعمال مخصوص معنوں میں ہوتا ہے، جس کی واضح طور پر وضاحت کے لیے ''نامیاتی ارتقاء'' یا ''organic evolution'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

ارتقاء اور ڈارون ازم...ایسا لگتا ہے کہ یہ دو الفاظ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ ارتقاء کہیں یا ڈارون ازم، ایک ہی بات ہے۔ لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں۔ ارتقاء کے میدان میں ڈارون کا کام ناقابلِ فراموش ہے، لیکن وہ نہ تو پہلا شخص ہے جس نے ارتقاء کا تصور یا نظریہ پیش کیا اور نہ آخری۔ دنیا کی تاریخ میں ڈارون سے پہلے بہت سے ایسے مفکرین اور سائنسدان ملتے ہیں جنہوں نے ارتقاء کا تصور پیش کیا۔ خود یورپ کی تاریخ میں ڈارون پہلا آدمی نہیں جس نے اس نظریہ سے بحث کی ہو۔ ایک مغربی مصنف لارسن لکھتا ہے:

"The history of modern evolutionary science does not begin with Charles Darwin or even with biology." (Larson, p.xvi)

[''جدید ارتقائی سائنس کی تاریخ کا آغاز ڈارون سے نہیں ہوتا، اس کی ابتدا حیاتیات سے بھی نہیں ہوتی۔'']

مزید براں، ہمیں ارتقاء (evolution) اور ارتقائی نظریات (theories of evolution) میں فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بطور تصور، ارتقاء آج سائنس کی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ یہ اصل میں اس سوال کا جواب ہے کہ جاندار، پودے اور حیوانات، کیسے وجود میں آئے۔ یہ خصوصی تخلیق کے نظریہ (Theory of special creation) کا متبادل ہے۔ خصوصی تخلیق کے نظریہ کے مطابق جانداروں کی انواع غیر تغیر پذیر ہیں اور یہ اپنی موجودہ شکلوں ہی میں تخلیق کی گئی تھیں۔ چاہے کتنا ہی زمانہ گزر جائے اور حالات چاہے کیسے ہی ہو تے جائیں، انواع خود کو برقرار رکھتی ہیں جبکہ تصور ارتقاء کے مطابق تمام جاندار سادہ ترین شکلوں سے مسلسل، درجہ بدرجہ، ترقی کرتے ہوئے موجودہ شکلوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ انواع تغیر پذیر ہیں، اور وقت گزرنے کے ساتھ مخصوص حالات کے تحت سادہ انواع زیادہ پیچیدہ انواع میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یہ تصور آج ارتقائی سائنس (evolutionary science) کہلاتا ہے۔ عمومی طور پر تمام سائنسدان اسے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ اس نظریہ کے شواہد اتنے مضبوط ہیں کہ کوئی بھی باخبر سائنسدان اس سے اصولی اختلاف نہیں کرتا۔ ان معنوں میں ارتقاء ایک ایسا تصور ہے جس کی جڑیں ماضی میں بہت دور تک گئی ہوئی ہیں۔ بعض یونانی فلسفیوں نے اس کی طرف اشارے کئے ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ میں بہت سے مسلم مفکرین نے زیادہ تفصیل سے اس کی وضاحت کی ہے۔ جب بھی ارتقاء، تصورِ ارتقاء یا نظریہ ارتقاء کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں تو ان سے مراد یہی حقیقت ہوتی ہے۔

اس کے برعکس، ارتقاء کے نظریات اس سوال سے بحث کرتے ہیں کہ ارتقاء ہوتا کیسے ہے؟ یہ ارتقاء کے طریقہ یا میکانزم (میکانیت) کا سوال ہے۔ ڈارون کا کام بنیادی طور پر اسی سوال سے تعلق رکھتا ہے۔ ڈارون نے اپنی تحقیق اور سوچ بچار کی بنیاد پر ارتقاء کا ایک میکانزم تجویز کیا جسے ڈارون کا نظریہ ارتقاء یا ڈارونزم کہتے ہیں۔ ڈارون کے نظریہ کے ظاہری ڈھانچہ میں نئے حقائق کے پیش نظر ردوبدل ہوتا رہا ہے۔ آج اس کی جو شکل پائی جاتی ہے اسے جدید ڈارون ازم (نیو ڈارون ازم NeoDarwinism) کہا جاتا ہے۔ ایک مغربی مصنف لارسن (Edward J.Larsan) نے اس نکتے کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"...The terms "Darwinism" and "Neo-Darwinism" apply here only to the specific theory that evolution proceeds through the natural selection of minute, random, inborn variations, while the terms "evolution" and "evolutionism" apply to the general concept of descent with modification." (p.107)

[''ڈارون ازم اور نیو ڈارون ازم کی اصطلاحیں یہاں اس خاص نظریہ کے لیے استعمال

ہوتی ہیں جس کے مطابق ارتقاء باریک، غیر منظم، پیدائشی تغیرات کے فطری انتخاب کے ذریعے ہوتا ہے۔ جبکہ ارتقاء اور ارتقائیت کی اصطلاحوں کا اطلاق اس عمومی تصور پر ہوتا ہے جس کے مطابق سادہ انواع ترامیم و تغیرات کے ذریعے پیچیدہ انواع میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔"]

بعض لوگوں کے خیال کے برعکس، سائنسدان ارتقاء کو عام مفروضہ (Hypothesis) نہیں مانتے۔ یہ سائنسی تعریف کے مطابق اگرچہ ایک نظریہ ہے، مگر ایک مضبوط نظریہ۔ حیاتیات میں اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسی طبیعیات میں نظریہ تجاذب (gravitation) کی۔ ورنن کیلوگ (Vernon Kellogg) کے الفاظ میں:

"....the descent of species is looked upon by biologists to be as proved a part of their science as gravitation in the science of physics." (Larsan, p. 129)

ڈارون کی مشہورِ زمانہ کتاب ابتدائے انواع (The Origin of Species) ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس سے تقریباً نصف صدی قبل، ۱۸۰۲ء میں فرانس کے مشہور سائنسدان لمارک (Lamarck) نے نامیاتی ارتقاء کا ایک جامع نظریہ پیش کیا تھا (لارسن، صفحہ ۳۸)۔ لمارک کے نظریہ کو قلبِ ماہیت کا مفروضہ (the transmutation hypothesis) کا نام دیا گیا۔ اب اسے عام طور پر لمارک ازم (Lamarckism) کہا جاتا ہے۔ لمارک کے مطابق ارتقاء "اکتساب شدہ خصوصیات کے توارث" (Inheritance of acquired characters) کے ذریعے واقع ہوتا ہے۔ تاہم بعد کی سائنسی تحقیق سے اس نظریہ کے حق میں مضبوط شہادتیں حاصل نہیں ہوسکیں۔

ارتقاء کے مختلف نظریات میں سے ایک نظریہ تبدل (theory of mutation) بھی ہے، جسے ایک ولندیزی نباتیات دان ڈی وریز (Hugo de Vries) نے ۱۸۹۰ء کی دہائی میں پیش کیا تھا۔ اس کے مطابق نئی انواع جانداروں کے جینز (genes) میں تغیرات کے ذریعے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ کئی وجوہ کی بنیاد پر اس نظریہ کو بھی وسیع پیمانے پر پذیرائی حاصل نہ ہوسکی۔

لہٰذا، ڈارون کے نظریہ کی وسیع کامیابی اور پذیرائی کے باوجود یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ یہ ارتقاء کا واحد نظریہ ہے۔ ایک مغربی مصنف باؤلر (P.J Bowler) نے اس حقیقت کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

"There is no single theory of evolution, only an array of rival depictions of how new forms of life originate. Over the last century or more, biologists have tried out many different ideas, and nonscientists have expressed passionate support for some of the alternatives. In scientific biology, the Darwinian theory of natural selection has achieved dominant status following its synthesis with genetics in the mid-twentieth century." (p. 8)

["ارتقاء کا کوئی ایک نظریہ نہیں، بلکہ کئی متحارب نظریات ہیں، جو زندگی کی نئی شکلوں کے وجود میں آنے کی وضاحت کی کوشش کرتے ہیں۔ حیاتیات دانوں نے گزشتہ صدی یا اس سے زیادہ عرصے کے دوران بہت سے مختلف نظریات کو آزمایا اور غیر سائنسدانوں نے بعض متبادلوں کے لیے جذباتی تائید کا اظہار کیا۔ سائنسی حیاتیات میں فطری انتخاب کے ڈارونی نظریہ نے بیسویں صدی کے وسط میں جینیات کے ساتھ اپنے ملاپ اور ائتلاف کے بعد غالب نظریہ کا مقام حاصل کرلیا۔"]

لہٰذا، یہ ایک علمی حقیقت ہے کہ ارتقاء اور ارتقاء کے نظریات دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ ارتقاء کے مختلف نظریات دراصل اس عام طور پر تسلیم شدہ حقیقت کی تشریح کرنا چاہتے ہیں کہ ارتقاء ہوا کیسے ہے۔ ڈارون کا نظریہ، ارتقاء کی تشریح کا ایک زبردست نظریہ ہے۔ اسے فطری انتخاب (Natural selection) کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ چارلس ڈارون نے ۱۸۵۹ میں اپنی کتاب The Origin of Species میں پیش کیا تھا۔ یہ بات معلوم ہے کہ ڈارون اس نظریہ تک کئی سال کی انتھک تحقیق، مطالعے اور غور و فکر کے بعد پہنچا تھا۔ اس کی کتاب کا شمار ان کتابوں میں ہوتا ہے جنہوں نے انسانی سوچ کے دھارے کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے باوجود، ڈارون کا نظریہ کوئی جامد (static) شے نہیں ہے۔ چنانچہ، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود اس میں ارتقاء ہوا ہے۔ اس کا مرکزی تصور اور روح برقرار ہے، تاہم نئے دریافت شدہ حقائق (مثلاً جینیات اور مالیکیولی حیاتیات کے میدانوں میں سامنے آنے والی حقیقتوں) نے ڈارون کے نظریہ کو ردوبدل سے ہمکنار کیا ہے۔ اس وقت حیاتیات میں اس کی حیثیت ایک ایسے نظریہ کی ہے جسے عام طور پر درست مانا جاتا ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ آگے چل کر اس سے کوئی بہتر نظریہ وجود میں آجائے جو ارتقائی حقیقتوں کی زیادہ کامیابی کے ساتھ وضاحت کرسکتا ہو۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ارتقاء کے کسی نظریہ کے جزوی یا کلی طور پر غلط ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ارتقاء کا تصور بذاتِ خود درست نہیں رہا۔ فرض کریں کہ کل ڈارون کا نظریہ غلط ثابت ہوجاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ارتقاء کا بنیادی فلسفہ ہی درست نہیں۔

بعض لوگ بالخصوص مذہبی جوشیلے ڈارون کو ہدف تنقید بناتے اور بزعم خود اسے غلط ثابت کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے نظریہ ارتقاء کا رد کردیا ہے۔ یہ بات ایک مغالطے اور خود فریبی کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

اگر ہم ڈارون سے اختلاف رکھتے ہوں تو بھی ہمیں اس کے کام کی قدر کرنی چاہیے۔ اس نے اپنا نظریہ کئی سالوں پر محیط وسیع تحقیق کی بنیاد پر قائم کیا اور مضبوط سائنسی دلائل کے ساتھ سمجھایا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈارون کی تحقیقی کاوشوں سے خود ارتقاء کے تصور کو بھی تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ارتقاء حیاتی شکلوں (Life forms) کے درمیان تعلق کو بیان کرتا اور انہیں ایک نقشہ یا پیٹرن (pattern) کی شکل دیتا ہے۔ ڈارون کا نظریہ اس پیٹرن کو سمجھنے اور اس کی منطق کو دریافت کرنے کی ایک بہترین کوشش ہے۔ یہ نظریہ ان مادی اسباب اور ان کی کارفرمائی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جو بالآخر انواع کی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ مگر کیا ارتقاء کا تصور اس بات کی نفی کرتا ہے کہ ایک خدا ہے، جو جانداروں کو پیدا کرتا ہے؟ کیا تصورِ ارتقاء اور تصورِ خدا ایک دوسرے کی ضد ہیں یا ان میں کوئی اور تعلق ہے؟ اس اہم سوال کا جائزہ ہم اگلے باب میں لیں گے۔ ❀❀❀

کوہ ندا پر آوارہ بشارتیں

تحریر: وجاہت مسعود

فیض صاحب نے شب غم کے چاند کو یہ کہہ کر قریب بلایا تھا کہ 'نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم.... کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں'۔ علی گڑھ میں ریاضی کے مایہ ناز استاد ڈاکٹر ضیاالدین احمد کے بارے میں کہا جاتا ہے کسی شوخ چشم طالب علم کی فرمائش پر 'طول شب فراق' کا تختہ سیاہ پر حساب پھیلا کر جواب نکالا تھا 'لامحدود'۔ صاحبان نظر جانتے تھے کہ قریب ایک صدی بعد لاہور کا ایک شاعر اپنے مہ و سال کا المیہ کچھ یوں رقم کرے گا، 'لگتا ہے مرے گھر میں بہت دیر رکے گی....اس رات کی آنکھوں میں شناسائی بہت ہے'۔ اردو شعر کی روایت میں رات تو ابتدا ہی میں چلی آئی تھی۔ فرخ سیر نے ۱۷۱۳ء میں جعفر زٹلی کی زبان گدی سے اکھاڑی تو معلوم ہوگیا کہ اختیار کو شعر کی تاب نہیں رہی۔ میر کے ہاں رات 'وقت فغاں' ٹھہری۔ غالب نے رات کے بیان میں شمع اور بنات النعش کی جگل بندی سے کام لیا۔ بیسویں صدی میں فراق گورکھپوری پہلے شاعر تھے جنہوں نے رات کو اپنے شعری اثاثے میں کلیدی جگہ دی۔ فراق قوم پرست ہندوستانی تھے لیکن ان کا شعر اپنی ذات کی حکایت تھا۔ 'پچھلے کو بھی وہ آنکھ کہیں جاگ رہی ہے'۔ اجتماعی واردات کے بیان میں رات کے تلازمات کو فیض، ناصر اور منیر نے متعارف کرایا۔ جدید اردو شعر کی اس تثلیث کی نمود تک فارسی اس زمین سے مٹ چکی تھی لیکن اردو جاننے والے ابھی موجود تھے سو ان کے شعر کا ابلاغ بھی ممکن تھا۔ ہم بے ہنروں کا زمانہ لگتے لگتے پارلیمنٹ میں دشنام، اخبار میں پھکڑ اور سوشل میڈیا پر براہ راست گالی گفتار کا چلن پھیل گیا۔ کیا خاک جئے کوئی، شب ایسی سحر ایسی... شب اور سحر کے بیچ کہیں دن کی دھوپ کا وقفہ بھی پڑتا ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ پنڈی اور شاہراہ دستور میں مراسلت کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں۔ افواہ کی چپاتی البتہ بٹ رہی ہے۔ افغانستان میں طالبان کے ورود پر دو مہینے گزرنے کو آئے، حکومت کا اونٹ ابھی کسی کروٹ نہیں بیٹھ سکا۔ عالمی برادری کی منت وزاری میں اتنا جوش وخروش خود طالبان نے نہیں دکھایا، جس تندہی سے پاکستان کے زعما طالبان حکومت کو تسلیم کروانے اور ممکنہ انسانی المیے کی دہائی دے رہے ہیں۔ انسانی المیے کا لفظ کہیں سے پڑھ لیا ہے۔ کسی سے سن لیا ہے کہ پاؤں اکھڑنے کی نوبت آئے تو انسانی حقوق، انسانی ہمدردی اور داخلی خود مختاری کے سفید جھنڈے نکال لانا مفید ہوتا ہے۔ یہ نہیں بتاتے کہ طالبان کے سفید جھنڈے پر جو عبارت کندہ ہے، داعش کے سیاہ جھنڈے پر بھی وہی کلمات لکھے ہیں۔ طالبان کے عذر خواہ برسوں سوال اٹھاتے رہے کہ دہشت گردی کی 'تعریف' کی جائے۔ اب دنیا پلٹ کر پوچھ رہی ہے کہ طالبان اور داعش کے تصور سیاست میں مابہ الامتیاز کیا ہے؟ ایک گروہ قیدیوں کو پنجرے میں بند کر کے آگ لگا دیتا ہے، دوسرا فریق قیدیوں کو کرین سے لٹکا کر پھانسی دیتا ہے۔ ایک فریق نوجوان لڑکیوں کی خرید وفروخت کی منڈیاں سجاتا ہے اور دوسرا رات کی تاریکی میں دستک دے کر نا کتخدا بچیاں اٹھالے جاتا ہے۔ دونوں گروہ ایک ہی مذہب کا نام لیتے ہیں اور باہم دست وگریباں ہیں۔ کچھ مغرب زدہ راندہ درگاہ ایک مدت سے عرض دار تھے کہ سیاست دلیل کا نام ہے اور عقیدہ تسلیم کی اقلیم ہے۔ عقیدے کی بنیاد پر سیاست کا اصل مقصد تقدیس کی آڑ میں مخالف دلیل کو خاموش کرنا ہوتا ہے۔ مذہب کے نام پر سیاست سے عقیدے کا احترام مجروح ہوتا ہے اور سیاسی عمل کے معاشی اور تمدنی امکانات تاریک ہو جاتے ہیں۔ صاحبان اختیار ہوں یا اہل جنوں کا بے ہنگم انبوہ، کسی کو گوش شنوائی نہیں تھا۔ اب اس غفلت کا مآل دیکھ لیجئے۔ دنیا نے ہم سے منہ موڑ لیا اور ہمیں غرہ ہے کہ ہم نے دنیا کو تنہا کر دیا ہے۔ مشکل اس میں یہ ہے کہ دنیا کا روزگار ہماری نگہ التفات کا محتاج نہیں۔ ہمیں آئی ایم ایف سے لے کر ایف ٹیف تک نظر کرم کی طلب ہے۔ یورپین پارلیمنٹ میں جی ایس پی پلس اور خلیج سے موخر ادائی پر تیل کی خریداری کی فکر لاحق ہے۔ دنیا ہمارے انتظار میں نہیں۔ کہیں صنعتی اقوام کا جی ایٹ ہے تو کہیں یورپین یونین سمیت بیس ممالک کا جی ٹونٹی معیشت، ماحولیات اور پائیدار ترقی کے مسائل حل کرنے میں باہم تعاون کر رہا ہے۔ کہیں جنوب مشرقی اقوام کے تعاون کا ادارہ آسیان ہے تو کہیں شنگھائی تعاون تنظیم ہے۔ ابھی امریکہ، برطانیہ اور آسٹریلیا نے مشرقی بحرالکاہل میں دفاعی تعاون کی بنا رکھی ہے تو امریکہ، جاپان، آسٹریلیا اور بھارت نے ممکنہ چینی اثر و نفوذ کا مقابلہ کرنے کے لئے کواڈ کے عنوان سے چار فریقی اتحاد قائم کیا ہے۔ ہم ایسے بلوان ہیں کہ بھارت نے ۵ اگست ۲۰۱۹ کو یک طرفہ کارروائی کرتے ہوئے متنازع جموں کشمیر کی حیثیت ہی زیروزبر کر دی اور ہم اسلامی سربراہ کانفرنس کا اجلاس تک نہیں بلا سکے۔ یاد رہے کہ یحییٰ خان کے احتجاج پر رباط کانفرنس سے بھارتی مندوب کو اٹھا دیا گیا تھا۔ اب بھارتی مندوب اسی پلیٹ فارم پر مبصر کے طور پر بیٹھتا ہے۔ اس تصویر کا اصل پس منظر یہ ہے کہ ہم نے اپنے ملک میں عوام اور ریاست میں مناقشہ چھیڑ رکھا ہے۔ یہ جو لندن میں بیٹھے میاں نواز شریف نے 'حقیقی احتساب' کا نعرہ بلند کیا ہے تو اس شیر کی کھال میں طوفان ایسی تازہ توانائی کے دو منابع ہیں، ملکی معیشت کی بدحالی اور دنیا کا بدلتا ہوا نقشہ۔ ہم ایک فالٹ لائن پر بیٹھے ہیں۔ اس سے آگے یا تو ہمہ گیر بحران ہے یا شفاف پانیوں کا پرسکوت خرام۔ کوہ ندا پر آوارہ بشارت خوشی کی نوید بھی ہو سکتی ہے اور طول شب غم بھی۔ ابھی نوٹی فیکیشن کا انتظار ہے۔ ابھی بات کھلنے میں دیر ہے۔

❁❁❁

کابل، طالبان، امریکہ اور گیم آف تھرونز

شعبہ انٹرنیشنل

تحریر: ذیشان محمود

کارل مارکس کا مشہور قول ہے:

'تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، اول المیہ کے طور پر، دوسرا طنز کے طور پر۔'

کابل دنیا کا وہ معروف شہر جو زبان زد عام ہے۔ لیکن ٹھہریے یہ دبئی، پیرس، وینس یا میامی کی طرح دلفریب مناظر کی وجہ سے نہیں اور نہ ٹوکیو، لندن یا واشنگٹن ڈی سی کی طرح ایسے دار الحکومت ہیں جہاں جانا ہر کس و ناکس کے لئے ایک خواب ہے۔ قریباً ۴۰ سال سے جاری جنگ تو مستحضر نہیں البتہ بچپن سے طالبان کا نام خوب یاد ہے کیونکہ اخبارات میں طالبان کے بیانات پڑھ پڑھ کر ان کی مذہبی شدت پسندی کا علم ہوتا رہتا تھا۔ لیکن دنیا کو طالبان کا اصل چہرہ تو ۹/۱۱ کو نظر آیا یا دنیا کو دکھایا گیا۔ مجھے وہ دن خوب یاد ہے۔ بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کا آخری دور تھا۔ پی ٹی وی مسلسل ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی جڑواں عمارتوں المعروف Twin Towers سے طیارے کے ٹکرانے اور پھر ان کے گرنے کا منظر دکھا رہا تھا۔

تب طالبان کے ساتھ ایک اور نام اسامہ بن لادن ذہن میں ایسا نقش ہو گیا کہ ہر کس و ناکس اس سے ڈرتا یا گن گاتا نظر آتا۔ یہاں تک کہ ۲۰۱۱ء میں ہمارے گریجوایشن کے انگریزی کے سالانہ پرچہ میں بھی اسامہ بن لادن کی موت اور پاکستان کے کردار سے متعلق سوال ڈالا گیا۔ معلوم نہیں کہ ممتحن اسامہ کے حامی تھے یا مخالف لیکن انہوں نے ہمارے جواب سے مطمئن ہو کر ہمیں انگریزی میں پاس ضرور کر دیا۔ ۹/۱۱ کے دلخراش سانحہ کے بعد کراچی میں ہر جگہ افغانی مہاجرین نظر آنے لگے۔ خاموش، میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس، سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں کچرے جمع کرنے کا تھیلا لئے گلی گلی گھومتے نظر آتے۔ جب ان کی اردو سے شناسائی ہوئی تو بعض نے سبزی اور پھلوں کی ریڑھی لگالی۔ ایک بار علی الصبح ایک افغانی مہاجر لڑکے نے دروازہ کھٹکھٹایا اور دس ہزار کے افغانی نوٹ کے بدلے پچاس روپے مانگنے لگا۔ کرنسی کی اتنی سمجھ تو تھی نہیں۔ بار بار ہاتھ سے منہ کی طرف اشارہ کر کے بھوک کا اشارہ کرتا۔ اس کو پچاس روپے دے کر وہ نوٹ سنبھال لیا۔ بعد میں معلوم ہوا اس کی کچھ وقعت تو تھی نہیں تو اسے البم کی زینت بنالیا۔ کراچی ویسے ہی مہاجروں کا شہر کہلاتا ہے تو مزید مہاجرین کو آشیانہ فراہم کرنے میں کامیاب رہا کیونکہ کراچی کا دل اس کے سمندر کی طرح وسیع ہی ہے۔ پھر ہر جگہ افغانی مہاجرین نظر آنے لگے بسوں میں، سڑک کنارے مزدوروں کے ساتھ کام کا انتظار میں، بازار یا جمعہ بازار میں دکان لگاتے اور گلیوں میں کچرا چنتے۔ لیکن کوئی سکول میں نظر نہ آیا کیونکہ بچے بھی کچرا چنتے ہی نظر آتے۔ یہ افغانی مہاجرین بھیک نہیں مانگتے تھے، اس کے لئے ہمارا اپنا مافیا ہی کافی تھا۔ جب چائنہ کی مارکیٹ بڑھی تو 'سب چائنہ اے' کے سٹال یا ریڑھیاں یا ہاتھوں میں مختلف چیزیں اٹھائے گلی گلی یا چوک یا چورنگیوں پر یہ پھرتے نظر آتے۔ لیکن پھر بھی پشتون یا پختون اور افغانیوں میں فرق کا معیار یہ ٹھہرا کہ افغانی تو صرف کچرا چنتے ہیں۔ گزشتہ صدی سے ہی امریکہ سپر پاور ہے اور دنیا کے نقشہ پر اپنے محل وقوع کے سبب حکمرانی کر رہا ہے۔ اپنے مغرب سے دنیا کے مشرق کو اور اپنے مشرق سے دنیا کے مغرب کو دور رکھے ہوئے ہے۔ اس تک جانے کے لئے سات سمندر حقیقتاً پار کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن اسے بھی سات سمندر پار کر کے دنیا میں آنا تھا۔ اس لئے اس نے مشرق میں divide and rule کی گیم کھیلی۔

۹/۱۱ کے بعد پوری دنیا بدل چکی تھی۔ ہر ملک نے اپنا دفاع مضبوط کیا۔ لیکن کابل کے پڑوسی ممالک کو بہت بڑی قیمت چکانی پڑی۔ سپر پاور کے مقابل جو آتا گیا وہ اسے کچلتا رہا۔ اور جمہوریت کے نام پر خود آمریت سے اتحاد بناتا رہا۔ لیکن یہ گتھی کوئی سلجھا نہ سکا کہ سپر پاور کو اسلامی ممالک سے ہی خطرہ کیوں؟

وقت گزرتا رہا دھیرے دھیرے رات ڈھلتی رہی اور صبح کی سفیدی ظاہر ہونی شروع ہوئی۔ یہ رات بہت لمبی تھی، بیس سال لمبی رات۔ جیسے گیم آف تھرونز میں سارے قبائل کے سر پر سردیوں کا ایسا خوف طاری رہا کہ جیسے دنیا کا خاتمہ ہونے چلا پھر اچانک ایک رات میں ہی اس عود آئی سردی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور وہاں سے آئی مصیبت ختم ہوئی۔ بعینہٖ یہی کچھ کابل کے ساتھ ہوا۔ تاریخ دہرائی گئی۔ المیوں کے ساتھ ہی طنز وار دہوا۔ یک نہ شد دو شد! طالبان کی حکومت کا دھڑن تختہ کیا گیا۔ پھر علاقے تقسیم ہوئے Game of Throne کی طرح UN، G7، نیٹو اور نہ جانے کون کون سی طاقتوں کے اتحاد نے مل کر ایک صدر افغانستان پر بٹھا دیا۔ اس اتحادی افواج اور جمہوریت کے نفاذ کے باوجود امن عام قائم نہ ہو سکا۔ یو ایس کے ڈرون نما ڈریگن نے عوام پر جب چاہا آگ برسائی یا جاتے جاتے آسمان سے نیچے پٹخ دیا مرکز پر حکومت کے لئے ہر کوئی پر تول رہا تھا۔ ہر کوئی راجہ بننے کا خواب آنکھوں میں سمائے بیٹھا تھا۔ مرکزی حکومتی اور چند اتحادی اہلکار مرتے رہے۔ دشمن سے بچاؤ کے لئے قائم کی گئی امریکی دیوار میں شگاف پڑ گئے۔ حفاظتی دستے تھک گئے۔ پھر یکایک دیوار ٹوٹنی شروع ہوئی اور آخری وار میں حکومت بھی ڈھے گئی۔

تاج و تخت کی لڑائی میں جیت تخت کے وارث کی ہوئی، عوام پس گئی اور بالآخر کابل کا سقوط عمل میں آ گیا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ بظاہر فاتح ہی حکمران بنتا ہے یا کوئی پوشیدگی میں بیٹھی طاقت تخت کی اصل وارث بن کر سامنے آتی ہے۔ ایک بات تو طے ہے جیسے گیم آف تھرونز میں پیٹر جب کہتا ہے کہ Knowledge is power تو ملکہ سرسی اس کو سر عام طاقت کا مظاہرہ کر کے کہتی ہے Power is power۔ یہی حقیقت ہے حکمرانوں کی لڑائی تو عوام اور فوجی لڑتے ہیں۔ عام آدمی کے لئے تو فرش ہی اوڑھنا بچھونا ہے۔ حاکم کو یا تو فتح پر تخت نشینی اور بالا خانے ملتے ہیں یا شکست کھانے پر پاتال کی سرنگوں سے وہ فرار ہو جاتا ہے۔ اس بات سے لا پرواہ کہ اب عوام کے سر پر کون ہو گا۔ ایسے حکام کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرتی اور یہی تاریخ ہے، یہی المیہ ہے اور یہی طنز ہے۔ کیونکہ گیم آف تھرونز چلتی رہی ہے اور چلتی رہے گی۔

❁❁❁

ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل

مولوی محمد باقر: 1857ء کا پہلا شہید صحافی

تحریر: شاہد صدیقی علیگ

مولوی سید محمد باقر دہلوی پہلی ملک گیر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد شہید ہونے والے پہلے صحافی ہیں، جو اپنے زورِ قلم سے کمپنی بہادر کے جور و ستم اور آزادی کے لیے عوام کو بیدار کر رہے تھے جن کی بلیغ کاوشوں سے ہر کس و ناکس تخریب کار انگریزوں سے نتیجہ خیز لڑائی کے لیے راغب ہو گیا، مگر جس کی سزا انہیں اپنی جان دے کر چکانی پڑی۔

محمد باقر ۱۷۸۰ء میں دہلی کے معزز گھرانے میں پیدا ہوئے جن کے والد مولوی محمد اکبر علی ایک مذہبی اسکالر تھے، والد ماجد نے ہی مروجہ دستور کے مطابق گھر پر ابتدائی تعلیم دی جو اردو، فارسی، عربی و دینیات پر مشتمل تھی، انہوں نے جلد ہی ان پر دسترس حاصل کی، مزید تعلیم کے لیے ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج کا رخ کیا اور تکمیل کے بعد وہیں ۱۸۲۸ء میں فارسی کے استاد بن گئے، جہاں انہوں نے چھ سال خدمات انجام دیں، علاوہ ازیں محکمہ محصول میں تحصیلدار بھی رہے، لیکن انہیں کہیں قلبی سکون میسر نہیں ہوا۔ اسی اثنا میں جب کمپنی حکومت نے ۱۸۳۴ء میں 'پریس ایکٹ' میں ترمیم کر کے عوام کو اخبار شائع کرنے کی اجازت دی تو انہوں نے صحافت کے میدان میں قسمت آزمائی کی۔

سنہ ۱۸۳۴ء میں لتھو گرافک پریس خرید کر ۱۲/ جنوری ۱۸۲۲ء میں ہفتہ وار 'دلی اردو اخبار' کے نام سے اشاعت شروع کر دی، جس کی ماہانہ قیمت ۲ روپے تھی۔ کوئی اسے آدھے سال کے لیے ۱۱/ روپے یا سالانہ ۲۰/ روپے میں جاری کرا سکتا تھا۔ جو تقریباً ۲۱/ سال تک جاری رہا۔ حالات کے مدنظر دوبار اس کا نام بھی بدلا گیا۔ پہلی بار ۳ مئی ۱۸۴۰ء کو اس کا نام تبدیل کر کے "دہلی اردو اخبار' رکھا گیا جبکہ دوسری بار ۱۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی اردو اخبار کا نام بدل کر مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے نام پر "اخبار الظفر" رکھ دیا گیا اور اخبار کو ہفتہ کی بجائے اتوار کو شائع کرنا شروع کر دیا۔ جس میں دلّی کے ساتھ ساتھ قرب و جوار کے علاوہ لکھنؤ، آگرہ، گوالیار، جھانسی وغیرہ کے واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی تھیں۔ اخبار حقیقی معنوں میں انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس نے آزادی کی مشعل کو روشن کر کے ہندوستانیوں کو برطانوی راج کے خلاف 'کرو یا مرو' کا حوصلہ عطا کیا۔

دس ۱۰/ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے پہلی ملک گیر جنگ آزادی کے شعلوں کو ہوا دینے والے سپاہیوں نے جب ۱۱/ مئی کو دلّی کی دہلیز پر دستک دی تو میر باقر کے دلّی اردو اخبار نے انقلاب کا ترجمان بننے میں دیر نہیں کی اور اپنے قلم سے قارئین کو ہر واقعہ سے باخبر کرنے کے ساتھ انہیں آزادی کی اہمیت اور غلامی کی لعنت سے بھی روشناس کرایا۔ ۱۷ مئی ۱۸۵۷ کی اپنی رپورٹ میں دہلی اردو اخبار نے مجاہدین کی پیش قدمی کی تفصیلی رپورٹ پیش کی اور مسلسل تحریک آزادی کے بارے میں مضامین لکھتے رہے۔ چوبیس ۲۴/ مئی ۱۸۵۷ء مطابق ۲۹ ماہ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ روز یک شنبہ کے شمارے میں سپاہیوں کو ثابت قدم رہنے کے لیے لکھتے ہیں کہ: "جس طرح سلیمان اور سکندر جیسے عظیم شہنشاہ، چنگیز خان، ہلاکو اور نادر شاہ جیسے ظالم، افسانوی ہیرو اور رباب سب غائب ہو گئے تھے انگریز بھی ایک دن غائب ہو جائیں گے"۔ انگریز اپنی حکومت کی پائیداری کے لیے ہندو اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا ضروری سمجھتے تھے لہٰذا انگریزوں نے جنگ آزادی کی شروعات میں ہی ایسے پوسٹر چسپاں کر دیئے تھے جن میں کارتوسوں کی چربی کا حوالہ دیکر انقلابی مسلمانوں اور ہندوؤں میں تعرض پیدا کرنے کی تلقین کی گئی تھی کہ "یہ چربی صرف (گئو) کی تھی اس لیے مسلمان سپاہ نہ صرف ہندو باغیوں سے الگ ہو جائیں بلکہ ہمارے شریک ہو کر اہل ہنود کو قتل کریں"۔

جس کے خلاف ہندو مسلم اتحاد کے نقیب مولوی محمد باقر نے پوری شدت سے آواز اٹھائی اور ہندو اور مسلمان دونوں کو متنبہ کیا کہ: ۱۴/ جون ۱۸۵۷ مطابق ۲۱/ شوال المکرم ۱۲۷۳ھ کے شمارے میں لکھا کہ "یاد رہے کہ جو ایسے وقت میں چُوکا اور تغافل کیا اور دھوکہ میں آیا اور نصارا کی ترغیب اور رلجاجب اور وعدہ وعید یا رعب سابق پر فریفتہ ہو گیا تو انجام کو دین و دنیا میں پشیمانی حاصل کرے گا اور پھر پچھتاوا کچھ کام نہ آوے گا، سب آخر کو سر پر ہاتھ رکھ کے رو دیں گے"۔ عوام کو نوآبادیاتی حکمرانوں کے سازشوں اور ہتھکنڈوں کے خلاف خبردار کیا تو محمد باقر ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھنے لگے تو وہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تدابیر واضع کرنے لگے۔ آخر کار وہ گھڑی بھی آ گئی کہ جب ننگ وطن، ننگ دین کی کارستانیوں کے سبب انگریز دلّی کے کشمیری گیٹ کو توڑ کر شاہجہان آباد میں داخل ہو گئی اور انہیں اپنی فتح یابی نظر آنے لگی۔

ایسے موقع پر انگریزوں نے اپنے قلم سے جہاد کرنے والے مولوی محمد باقر کو ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا اور انہیں ۱۶/ ستمبر کو میجر ولیم اسٹیفن رائیکس ہوڈسن کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے بغیر مقدمہ چلائے مولانا باقر کو اپنی گولی کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا۔ تاریخ جنگ آزادی ہند اس سرفروش اردو صحافی مولوی باقر کے تذکرہ بغیر کبھی پوری نہیں ہو سکتی ہے۔

❁❁❁

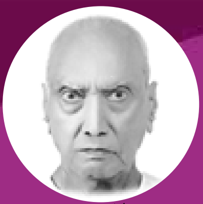

موپساں کا ”نیکلیس“ اور سمرسٹ مائم کا ”لاکٹ“

تحریر: تشنہ بریلوی

تُرکی سے آنے والے ہار کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا۔ یہ ہار ایک ملک کی خاتونِ اول نے ہدیہ کیا اور اگر یہ کسی دوسرے ملک کی خاتونِ اول تک پہنچ جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایسی قیمتی اشیاء قیمتی لوگوں کے ہاتھوں میں ہی رہیں تو بہتر ہے۔ ہم جیسے لوگ اِن کی قدر کیا جانیں اور خاتونِ اول کا ہدیہ فروخت کرنا بھی کسی طور مناسب نہیں اس لیے کہ ہدیہ برائے فروخت نہیں ہوتا۔ جہاں تک غریب خواتین کی مدد کا سوال ہے تو غریب خواتین کی مدد کے لیے ہمارے وڈیرے، پیر، سردار، جاگیردار، خان اور پولیس والے ہمہ وقت مشغول ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کو تو اس کے علاوہ کوئی اور کام ہی نہیں۔ لہذا اس ترک ہار کو فراموش کرتے ہوئے دو مشہور کہانیوں کا ذکر کرتے ہیں جو ہار ہی کے گرد گھومتی ہیں۔

سب سے پہلے تو فرانس کے شہرۂ آفاق فکشن رائٹر ”گی دا موپَساں“ Guy De Maupassant کی کہانی Collier(Necklace) کا ذکر ضروری ہے۔ سعادت حسن منٹو کو اردو کا موپساں کہا جاتا تھا، لہذا ہم موپساں کو فرنچ کا منٹو بھی کہہ سکتے ہیں۔ دونوں کم عمری میں انتقال کر گئے اور دونوں کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا لیکن دونوں نامور ترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

موپساں کی اس شاہکار کہانی میں ایک کم حیثیت میاں بیوی کا ذکر کیا گیا ہے۔ بیوی بہت خوبصورت ہے لیکن میاں غریب کلرک۔ بیوی صبر اور شکر کے ساتھ گذر بسر کرتی ہے۔ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ ایک بہت شاندار تقریب میں اُن کا بلاوا آ جاتا ہے۔ ایسی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے قیمتی لباس کے ساتھ کچھ زیور بھی ضروری ہے اور زیور بھی قیمتی۔ بیوی تقریب میں شرکت سے انکار کر دیتی ہے۔ میاں کہتا ہے کہ اس نے بڑی مشکل سے یہ دعوت نامہ حاصل کیا ہے اور وزیر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ بھی وہاں موجود ہوں گے۔ لباس کا تو کسی صورت سے انتظام ہو جاتا ہے لیکن زیور؟ خاتون کو یاد آتا ہے کہ اس کی ایک دولت مند ہم جماعت ہے۔

کیوں نہ اس سے زیور ایک دن کے لیے مانگ لیا جائے۔ خاتون کی دوست بڑی فیاضی سے اپنا تمام زیور دکھاتی ہے۔ خاتون کو ایک ڈائمنڈ کا نیکلس پسند آ جاتا ہے۔ لہذا وہ یہی ہار پہن کر تقریب میں شرکت کرتی ہے۔ ہر شخص کی نظر اس پر ہوتی ہے۔ وزیر صاحب بھی اس سے ملتے ہیں۔ تقریب کے اختتام پر انھیں سواری حاصل کرنے میں بہت دقت ہوتی ہے اور وہ رات کے چار بجے گھر پہنچتے ہیں۔ لباس تبدیل کرتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہار گم ہو چکا ہے۔ کہیں راستہ میں گر گیا ہوگا۔ میاں بیوی کا برا حال۔ فوراً ہی متبادل ہار کا انتظام کیا جاتا ہے اور ۳۶ ہزار فرانک میں ایک جوہری کی دکان سے ویسا ہی ہار خرید ا جاتا ہے۔ میاں بیوی اپنا سارا اثاثہ بیچ دیتے ہیں۔ دوستوں رشتے داروں سے ادھار لیتے ہیں اور دس سال کی محنت اور اذیت کے بعد سارا قرضہ اتار دیتے ہیں۔ ان دس برسوں میں خاتون سب کچھ کھو دیتی ہے خصوصاً اپنا حسن اور جوانی۔

ایک دن پارک میں اس کو اپنی پرانی دوست نظر آتی ہے جس سے اس نے ہار لیا تھا۔ دوست دس سال بعد بھی شاداب اور صحت مند ہے۔ خاتون اپنی دوست سے مخاطب ہوتی ہے ”ہیلو ژانیت“ ژانیت اس کی طرف دیکھتی ہے اور ایک اجنبی عورت کی اس بے تکلفی پر حیران ہو کر کہتی ہے ”مادام میں آپ کو نہیں جانتی۔ آپ کون ہیں؟“ ”ژانیت میں تمہاری پرانی دوست ماتھیلدا ہوں۔“ ”اچھا تو تم ماتھیلدا ہو۔ مگر تم کس قدر بدل گئی ہو۔ پہچاننا مشکل ہے۔“ ”جو کچھ بھی میری حالت ہے وہ تمہاری ہی وجہ سے ہے۔“ ”کیا مطلب؟“ ”تمھیں یاد ہے کہ دس سال پہلے میں نے تم سے ایک ڈائمنڈ نیکلس مانگا تھا۔“ ”ہاں، ہاں یاد ہے۔ وہ تو تم نے واپس بھی کر دیا تھا۔“ ”واپس ضرور کر دیا تھا لیکن دراصل تمہارا ہار کھو گیا تھا۔ میں نے ایک جوہری سے ۳۶ ہزار فرانک میں اس جیسا ہی ہار لے کر تمہیں واپس کیا تھا۔“ ”۳۶ ہزار فرانک“ ژانیت کھڑی ہو گئی ”ماتھیلدا تم کیا کہہ رہی ہو؟ میرا ہار تو Imitation (امیٹیشن) تھا۔ مشکل سے چار پانچ سو فرانک کا۔“ یہاں کہانی ختم ہو جاتی ہے لیکن اچھے افسانے کی طرح کہانی تو آپ سے چمٹ کر رہ جاتی ہے۔ لیکن موپساں کی سب سے زبردست کہانی تو Boulf De Suiff شمار ہوتی ہے کہ جس سے متاثر ہو کر کرشن چندر نے بھی ایک شاندار کہانی لکھی تھی۔

ولیم سمرسٹ مائم بہت مشہور افسانہ و ناول نگار تھا۔ اس کے افسانوں Rain اور Letter پر کئی فلمیں بھی بنیں۔ مائم نے بھی ہار کے بارے میں ایک کہانی لکھی۔ وہ پانی کے جہاز میں سفر کر رہا ہے اس کا روم میٹ ایک یہودی ہے جو بہت باتونی ہے۔ ایک اور مسافر بھی جھگڑالو قسم کا ہے وہ جاپان میں امریکی سفارت خانے میں ملازم ہے۔ اس کی خوبصورت بیوی بھی، جس سے وہ ایک سال بعد ملا ہے، جہاز میں اس کے ساتھ ہے۔ ایک دن میز پر چائے پیتے ہوئے یہودی اور امریکی مسافر کے درمیان بحث ہو جاتی ہے۔ امریکی مسافر کی بیوی کے گلے میں ایک بہت خوبصورت لاکٹ ہے۔ یہودی کہتا ہے کہ یہ ہار بہت قیمتی ہے اور دس ہزار ڈالر سے کم اس کی قیمت نہیں۔ امریکی مسافر ہنس کر کہتا ہے: ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ ہار تو میری بیوی نے نیویارک سے بیس ڈالر میں خریدا ہے۔ سو ڈالر کی شرط!“ یہودی کہتا ہے ”شرط منظور میں خود جیولر ہوں۔ ایک منٹ میں بتا سکتا ہوں کہ یہ ہار اصلی ہے یا نقلی۔ میں سو ڈالر ہارنے کو بالکل تیار ہوں۔ مادام ذرا ہار گلے سے اتاریں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنا محدب شیشہ نکالتا ہے۔

ہار کو ہاتھ میں لے کر یہودی اس کا بغور معائنہ کرتا ہے اور فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ سر اٹھاتا ہے لیکن قبل اس کے وہ کچھ بولے اس کی نظر عورت پر پڑتی ہے جو ملتجی نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے۔ یہودی کی مسکراہٹ غائب۔ وہ ہار واپس کرتا ہے اور کھڑے ہو کر اپنی ہپ پاکٹ سے ویلٹ نکال کر سو ڈالر کا نوٹ امریکی کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ ”ہاں میں غلطی پر تھا۔ یہ نقلی ہار بیس ڈالر سے زیادہ کا نہیں ہے۔“ یہودی کا خوب مذاق اڑایا جاتا ہے۔ رات کو جب مائم اور یہودی دونوں اپنے کمرے میں سونے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں تو اچانک دروازے کے نیچے سے ایک لفافہ سرکایا جاتا ہے۔ مائم دروازہ کھولتا ہے مگر کوئی نظر نہیں آتا۔ لفافہ پر کوئی نام نہیں۔ لفافہ کھولا جاتا ہے تو اس میں سے سو ڈالر کا ایک نوٹ برآمد ہوتا ہے۔ سو ڈالر کا نوٹ پکڑتے ہوئے یہودی کہتا ہے ”اگر میری ایک خوبصورت نوجوان بیوی ہوتی تو میں کسی حالت میں بھی اسے ایک سال کے لیے نیویارک میں اکیلا نہ چھوڑتا۔“

ہندوستان میں مشہور یادگاریں آپ ضرور دیکھیں

ہندوستان تنوع کی سرزمین ہے اور کچھ معماری اور تاریخی حیرت کا گھر ہے۔ بھارت کی حکومت ہندوستانی ویزا آن لائن درخواست کا ایک جدید طریقہ فراہم کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے درخواست دہندگان کے لئے ایک خوشخبری ہے کیونکہ اب ہندوستان آنے والے افراد کو آپ کے آبائی ملک میں ہندوستان کے ہائی کمیشن یا ہندوستانی سفارت خانے میں جسمانی دورے کے لئے ملاقات کا تقاضہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھارت کی حکومت درخواست دینے کے ذریعہ ہندوستان کے دورے کی اجازت دیتا ہے انڈین ویزا اس ویب سائٹ پر کئی مقاصد کے لئے آن لائن. مثال کے طور پر آپ کے ہندوستان سفر کے ارادے کا تعلق تجارتی یا کاروباری مقصد سے ہے تو آپ درخواست دینے کے اہل ہوں گے انڈین بزنس ویزا آن لائن (انڈین ویزا آن لائن یا کاروبار کے لئے ای ویزا انڈیا)۔ اگر آپ طبی وجوہات، ڈاکٹر سے مشورہ کرنے یا سرجری کے ل or یا اپنی صحت کے ل medical میڈیکل وزٹر کی حیثیت سے ہندوستان جانے کا سوچ رہے ہیں، بھارت کی حکومت بنا دیا ہے انڈین میڈیکل ویزا آن لائن آپ کی ضروریات کے لئے دستیاب ہے (میڈیکل مقاصد کے لئے انڈین ویزا آن لائن یا ای ویزا انڈیا)۔ ہندوستانی سیاحتی ویزا آن لائن (انڈین ویزا آن لائن یا ای ویزا انڈیا برائے سیاح) دوستوں سے ملنے، ہندوستان میں رشتہ داروں سے ملنے، یوگا جیسے کورسز میں شرکت کرنے یا دیکھنے اور سیاحت کے ل for استعمال کیا جاسکتا ہے۔

تاج محل

شاندار سنگ مرمر کی ساخت ۱۷ ویں صدی میں تعمیر کی گئی تھی۔ اسے مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے اپنی اہلیہ ممتاز محل کے لئے مقرر کیا تھا۔ یادگار میں ممتاز اور شاہ جہاں دونوں کا مقبرہ ہے۔ تاج محل ایک دلکشی ترتیب میں دریائے یمن کے کنارے قائم ہے۔ یہ مغل، فارسی، عثمانی ترک اور ہندوستانی طرز کے مختلف فن تعمیراتی عناصر کا مرکب ہے۔

مقبروں میں داخلہ ممنوع ہے لیکن سیاحوں کو محل کے خوبصورت ماحول میں گھومنے کی اجازت ہے۔ تاج محل دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہے۔ مقام۔ آگرہ، اتر پردیش

میسور محل

جنوبی ہندوستان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز ڈھانچے میں سے ایک میسور کا محل ہے۔ یہ انگریزوں کی نگرانی میں بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر ہندسرائیکینک طرز فن تعمیر میں کی گئی ہے جو مغل ہندطرز کے فن تعمیر کا احیائے طرز تھا۔ محل اب ایک میوزیم ہے جو تمام سیاحوں کے لئے کھلا ہے۔ جنوبی ہند کی سب سے عمدہ ڈھانچے میں سے ایک محل میسور ہے۔ یہ انگریزوں کی نگرانی میں بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر ہندسرائیکینک طرز فن تعمیر میں کی گئی ہے جو مغل ہندطرز کے فن تعمیر کا احیائے طرز تھا۔ محل اب ایک میوزیم ہے جو تمام سیاحوں کے لئے کھلا ہے۔

مقام۔ میسور، کرناٹک

سری ہرمندر صحاب

سری ہرمندر صحاب جسے گولڈن ٹیمپل بھی کہا جاتا ہے سکھوں کا مقدس مذہبی مقام ہے۔ ہیکل مقدس امرتسر سروور کے اس پار خوبصورت انداز میں ترتیب دیا گیا ہے جو سکھوں کا مقدس دریا ہے۔ یہ ہندو ہندو اور اسلامی طرز تعمیر کا ایک امتزاج ہے اور گنبد کی شکل میں دومنزلہ عمارت ہے۔ مندر کا بالائی نصف خالص سونے میں اور نیچے آدھا سفید سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے۔ ہیکل کی فرشیں سفید سنگ مرمر سے بنی ہیں اور دیواریں پھولوں اور جانوروں کے نشانوں سے مزین ہیں۔ مقام۔ امرتسر، پنجاب

بر ہدیشور مندر

یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثہ والے مقام کا حصہ بننے کے لئے یہ تین چولا مندروں میں سے ایک ہے۔ یہ مندر ۱۱ ویں صدی میں راجہ راجہ چولا اول نے تعمیر کیا تھا۔ اس مندر کو پیار یہ کویل کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اور یہ بھگوان شیو کے لئے وقف ہیں۔ مندر کا مینار meters high میٹر اونچا ہے اور یہ دنیا کی بلند ترین منزل میں ہوتا ہے..

مقام۔ تھانجاور، تمل ناڈو

لوٹس ہیکل

اس مندر کو لوٹس ہیکل یا کمل مندر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ سفید کمل کی شکل میں اس مثالی ڈھانچے کی تعمیر ۱۹۸۶ میں مکمل ہوئی تھی۔ یہ مندر بہائی عقیدے کے لوگوں کا ایک مذہبی مقام ہے۔ یہ مندر زائرین کو مراقبہ اور دعا کی مدد سے اپنے روحانی نفس سے مربوط ہونے کے لئے جگہ مہیا کرتا ہے۔ ہیکل کے باہر کی جگہ سبز باغات اور نوعکاسی کرنے والے تالابوں پر مشتمل ہے۔ مقام۔ دہلی

ہوا محل

پانچ منزلہ یادگار ۱۸ ویں صدی میں مہاراجہ سوئی پرتاپ سنگھ نے تعمیر کی تھی۔ اسے ہوا یا ہوا کا محل کہتے ہیں۔ اس کا ڈھانچہ گلابی اور سرخ سینڈ اسٹون سے بنا ہے۔ یادگار میں نظر آنے والے فن تعمیراتی طرزیں اسلامی، مغل اور راجپوت کا مرکب ہیں۔

مقام۔ جے پور، راجستھان

وکٹوریہ میموریل

یہ عمارت ۲۰ ویں صدی میں ملکہ وکٹوریہ کے لئے بنائی گئی تھی۔ پوری یادگار سفید سنگ مرمر سے بنی ہوئی ہے اور دیکھنے کے لئے حیرت انگیز ہے۔ یہ یادگار اب ایک میوزیم کھلا ہے جو سیاحوں کے لئے مجسمے، پینٹنگز اور مخطوطات جیسے نمونے کو ڈھونڈنے اور حیرت زدہ کرنے

کے لئے کھلا ہے۔ میوزیم کے آس پاس کا علاقہ ایک باغ ہے جہاں لوگ آرام اور رہر ے رنگ کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مقام۔ کولکتہ، مغربی بنگال

قطب مینار

یہ یادگار قطب الدین ایبک کے دور حکومت میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ ایک ۲۴۰ فٹ لمبا ڈھانچہ ہے جس میں ہر سطح پر بالکنیز ہیں۔ یہ ٹاور سرخ رنگ کے سینڈ اسٹون اور ماربل سے بنا ہے۔ یادگار ہند اسلامی طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔ یہ ڈھانچہ ایک پارک میں واقع ہے جس کے چاروں طرف بہت سی دوسری اہم یادگاریں ایک ہی وقت میں تعمیر کی گئی ہیں۔ یادگار کو فتح ٹاور کے نام سے بھی جانا جاتا ہے کیونکہ یہ راجپوت بادشاہ پرتھویراج چوہان پر محمد غوری کی فتح کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ مقام۔ دہلی

سانچی اسٹوپا

سانچی اسٹوپا ہندوستان کی قدیم یادگاروں میں سے ایک ہے کیونکہ اسے تیسری صدی میں انتہائی مشہور بادشاہ اشوک نے تعمیر کیا تھا۔ یہ ملک کا سب سے بڑا اسٹوپا ہے اور اسے عظیم اسٹوپا کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ ڈھانچہ مکمل طور پر پتھر سے بنایا گیا ہے۔

مقام۔ سانچی، مدھیہ پردیش

بھارت کے گیٹ وے

ہندوستان کی ایک نسبتاً new نئی یادگار برطانوی حکومت کے دوران تعمیر کی گئی تھی۔ یہ جنوبی ممبئی میں اپولو بندر کی نوک پر قائم ہے۔ اس سے پہلے کہ کنگ جارج پنجم ہندوستان تشریف لائے، اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے محراب گیٹ وے بنایا گیا تھا۔

گیٹ وے آف انڈیا دہلی میں واقع انڈیا گیٹ سے الجھن میں پڑسکتا ہے اور پارلیمنٹ اور صدر کے گھر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مقام۔ ممبئی، مہاراشٹر

لال قلعہ

ہندوستان کا سب سے اہم اور مشہور قلعہ مغل بادشاہ شاہ جہاں کی حکومت کے دوران ۱۶۴۸ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ بڑے قلعے نے مغلوں کے تعمیراتی انداز میں سرخ رنگ کے پتھروں سے تعمیر کیا ہے۔ قلعہ خوبصورت باغات، بالکونیوں اور تفریحی ہالوں پر مشتمل ہے۔

مغل حکمرانی کے دوران، یہ کہا جاتا ہے کہ قلعے کو ہیروں اور قیمتی پتھروں سے سجایا گیا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب بادشاہ اپنی دولت کھو بیٹھے تو وہ اس طرح کے لاڈ کو برقرار نہیں رکھ سکے۔ ہر سال ہندوستان کے وزیر اعظم لال قلعے سے یوم آزادی کے موقع پر قوم سے خطاب کرتے ہیں۔ مقام۔ دہلی

چار مینار

چار مینار سولہویں صدی میں قلی قطب شاہ نے تعمیر کیا تھا اور اس کا نام ڈھیل سے چار میناروں میں ترجمہ ہوتا ہے جو اس ڈھانچے کے بنیادی نکات کی تشکیل کرتی ہے۔ اگر آپ خریداری کے عاشق ہیں تو، آپ سامان خریدنے کی اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے قریبی چار مینار بازار جاسکتے ہیں۔ مقام۔ حیدرآباد، تلنگانہ

کھجوراہو

کھجوراہو مندر ۱۲ ویں صدی میں چندیلا راجپوت خاندان نے تعمیر کروائے تھے۔ پوری ساخت سرخ رنگ کے پتھر سے بنی ہے۔ مندر ہندوؤں اور جینوں میں مشہور ہیں۔ پورا علاقہ تین مندروں پر مشتمل ہے جس میں ۸۵ مندر رہیں۔ مقام۔ چھتارپور، مدھیہ پردیش

کونارک مندر

یہ مندر ۱۳ ویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا اور اسے مشہور سیاہ فام پوگوڈا کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ سورج دیوتا کے لئے وقف ہے۔ یہ مندر اپنے پیچیدہ فن تعمیر کے لئے قابل ذکر ہے جو ہزاروں سال پرانا ہے۔ بیت المقدس کا بیرونی حصa حیرت انگیز ہے کیونکہ اس کی ساخت ایک رتھ سے ملتی ہے اور اندر کا دیوار اور پینٹنگز سے سجا ہوا ہے۔

کونرک، اوڈیشہ

❁❁❁

شمعِ شوق

(ثاقب زیروی)

نظر نظر میں لئے جان و دل کے نذرانے
طوافِ شمع کو پھر آگئے ہیں پروانے
جبین پر گردِ رہِ عشق' دل میں نُوروسرور
ہیں آسمانِ عقیدت پہ آج دیوانے
جہان درد۔ لرزتی ہوئی صداؤں میں
محبتوں کے خزانے۔ دِلوں کے کاشانے
مصافحوں میں لپک اور معانقوں میں خلوص
عطا کیا ہے عجب سوز انہیں مسیحاً نے
وہ لوگ آئے ہیں آنکھوں میں شمعِ شوق لئے
جنہیں نہ پوچھا کبھی کم نگاہ دنیا نے
زمینِ ربوہ کو سجدوں سے ناپنے کے لئے
مچل رہے ہیں جبینوں میں پال نذرانے
کس اہتمام سے "اِک شمع انجمن" کے لئے
وفا کے نور میں ڈوبے ہوئے ہیں پروانے
یہ تین دن بھی عجب رحمتوں کے دن ہوں گے
کِھلیں گے دیدہ و دل میں گلوں کے پیمانے
شرابِ نُور سے دھولو دل و نظر ثاقب
نصیب ہوں کہ نہ ہوں پھر یہ دن خدا جانے

❁❁❁

وہ کام جو اقبال ادھورے چھوڑ گئے

تحریر: ڈاکٹر جاوید اقبال

بعض اہم موضوعات پر علامہ اقبال نے شعر یا نثر میں کچھ نہ کچھ تحریر کرنے کے منصوبے تو بنائے مگر زندگی نے وفا نہ کی، اس لیے اُن کی تکمیل نہ ہوسکی مثلاً مہاراجہ کشن پرشاد کو خط میں ''بھگوت گیتا'' کا اردو اشعار میں ترجمہ کرنے کے ارادے کا ذکر کرتے ہیں صوفی غلام مصطفی تبسم کو خط میں انگریزی میں ایسی کتاب لکھنے کا ذکر کرتے ہیں جس کا عنوان ہوگا ''اسلام میرے نقطۂ نگاہ سے'' نذیر نیازی فرماتے ہیں کہ حادثہ کربلا پر ہومر کے ''اوڈیسے'' کی طرز پر ایک طویل نظم لکھنا چاہتے تھے۔ جاوید نامہ میں اضافی ارواح سے ملاقاتوں کے بارے میں لکھنے کا سوچتے تھے۔ انگریزی میں ایک غیر معروف پیغمبر کی کتاب تحریر کرنے کا منصوبہ تھا۔

آخری ایام میں نواب بھوپال سے وعدہ کیا کہ ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' کے موضوع پر کتاب لکھیں گے۔ اس سلسلے میں میاں محمد شفیع (م۔ش) سے انگریزی میں کچھ ابتدائی نوٹس بھی لکھوائے گئے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے نام خط محررہ ۲۸/ مئی ۱۹۳۷ء میں فلاحی ریاست کے قرآنی تصور کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اصل سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے؟

خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ اور جدید نظریات کی روشنی میں اُس کی آئندہ ارتقاء میں حل موجود ہے۔ اسلامی قانون کے طویل اور محتاط مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر یہ ضابطۂ قانون صحیح طور پر سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو ہر ایک کے لیے کم از کم زندہ رہنے کا حق محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن قانونِ شریعت کا نفاذ اور ارتقاء اس سرزمین میں ناممکن ہے جب تک کہ آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں۔ اسلام کے لیے ''سوشل ڈیماکریسی'' کو کسی مناسب شکل میں جو اسلامی قانون کے اصولوں کے مطابق ہو، قبول کر لینا ''انقلاب'' نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف واپس جانا ہے۔''

ان منصوبوں میں بعض تو ادبی نوعیت کے ہیں، بعض کا تعلق فلسفہ، مابعد الطبیعیات یا دینیات سے ہے اور بعض خالصتاً عنقریب وجود میں آنے والی مسلم ریاست (پاکستان) کی عملی، سیاسی و معاشی ضروریات سے متعلق ہیں۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ، حادثہ کربلا پر ہومر کے اوڈیسے کی طرز پر نظم لکھنا یا جاوید نامہ میں اضافی ارواح شامل کرنا، ایسے ادبی منصوبے تھے جو شاعر کے تخیلی سمندر میں مضطرب لہروں کی طرح ابھرے اور ڈوب گئے، لیکن باقی منصوبوں کے بارے میں ایسا گمان کرنا درست نہ ہوگا۔ ''اسلام میرے نقطہ نگاہ سے'' یا ''ایک غیر معروف پیغمبر کی کتاب'' جیسی کتب تحریر کرنے کا اگر اُنھیں موقع مل جاتا تو تخلیقی سوچ کے اعتبار سے وہ خطبات اسلامی فکر کی تشکیل نو کی توسیع ہوتیں۔ اسی طرح ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' اور ''فلاحی ریاست کا قرآنی تصور'' کے موضوعات پر اگر وہ کتب تحریر کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو اُن کے افکار مسلمانان پاکستان کی مزید فکری رہبری کا باعث بن سکتے تھے۔

خطبات تشکیل نو کن کے لیے تحریر کیے گئے؟ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

''ان لیکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفہ سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفہ اسلام کو فلسفہ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے خیالات میں خامیاں ہیں تو اُن کو رفع کیا جائے۔''

جب یہ لیکچر علی گڑھ یونی ورسٹی کے طلبہ نے سنے تو صدر شعبۂ فلسفہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے علامہ اقبال سے کہا: ''جناب والا! آپ نے اسلام میں فلسفہ دین کی تشکیل نو کی بنیاد رکھ دی۔ مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلیں اس کے لیے آپ کی ممنونِ احسان ہیں۔ آپ کی فکر افزا مثال اوروں کی بھی ہمت بندھائے گی۔''

خطبات کے ایک مبصر سلیم احمد تحریر کرتے ہیں: ''اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کا چیلنج ایک نئی الٰہیات کی تشکیل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اقبال کی نئی الٰہیات کی کوشش کا حقیقی مقصد مغربی اور اسلامی تہذیب کے درمیان مشترکہ عناصر کی جستجو ہے۔ اگر ہمیں مغربی تہذیب کو قبول کرنا ہے یا اسے اپنے اندر جذب کر کے فائدہ اٹھانا ہے تو ہمیں مغربی اور اسلامی تہذیب کی روح میں اتر کر اُن کی ہم آہنگی کو الٰہیاتی بنیادوں پر ثابت کرنا پڑے گا۔ تشکیل جدید ان ہی معنوں میں ایک زبردست کارنامہ ہے جسے جدید اسلام کی بائبل کہنا چاہیے۔''

یہ سب اپنی جگہ درست۔ حقیقت یہی ہے کہ خطبات علامہ اقبال کی ایسی تصنیف ہے جسے علماء نے اگر پڑھنے کی کوشش کی تو اُسے ناپسند فرمایا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے تو صاف کہہ دیا کہ یہ کتاب اگر نہ لکھی جاتی تو بہتر ہوتا۔ جہاں تک مسلمانوں کی ''مغرب زدہ'' نئی نسل کا تعلق ہے، انھوں نے خطبات کو، جس توجہ کے وہ مستحق تھے، نہیں دی۔ پس علامہ اقبال کی ''فکر افزائی'' اوروں کی ہمت نہ بندھا سکی۔

خطبات کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ اُنھیں تحریر کرنے کی کئی وجوہ تھیں۔ پہلی یہ کہ علامہ اقبال کو احساس تھا کہ دنیائے اسلام ہر طور پر مغرب کی طرف جھکتی چلی جارہی ہے۔ وہ اس تحریک کے مخالف نہ تھے کیونکہ یورپی تہذیب عقل و دانش کے اعتبار سے اُنھی نظریات کی ترقی یافتہ صورت پیش کرتی ہے جن پر اسلام کی تمدنی تاریخ کے مختلف

ادوار میں غور وفکر کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں وہ یورپی تہذیب کو ایک طرح سے اسلامی تہذیب ہی کی توسیع خیال کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کی نئی نسل کے اس مطالبے کو جائز سمجھتے تھے کہ اسلامی عقائد اور نظریۂ حیات کا ایک بار پھر جائزہ لے کر ایسی نئی تعبیر یا تشریح کی ضرورت ہے جو وقت کے جدید تقاضوں سے مطابقت رکھتی ہو۔ اُنھیں خدشہ صرف اس بات کا تھا کہ مادہ پرست یورپی کلچر کی ظاہری چمک دمک ہمیں اتنا متاثر نہ کر دے کہ ہم اس کلچر کے حقیقی باطن تک پہنچ سکنے کے قابل نہ رہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ بقول اقبال انسان مختلف قسم کے رشتوں کے ذریعے خدا اور کائنات سے جڑا ہوا ہے۔ لہٰذا مطالعۂ فطرت یا سائنسی تحقیق بھی اپنی طرح کی عبادت ہے۔ وہ مسلمانوں کی نئی نسل کی توجہ سائنسی علوم کی طرف مبذول کرنے کی خاطر اُن پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ اسلام روحانی دنیا کے ساتھ مادی دنیا کو بطور حقیقت تسلیم کرتا ہے اور انسان کو مشاہداتی یا تجربی علوم کی تحصیل سے تسخیرِ کائنات کی دعوت دیتا ہے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ علامہ اقبال کے نزدیک روحانی (یا مذہبی) تجربہ بھی ایک نوع کا علم ہے جسے دیگر علوم کی طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے خطبات میں فکری نقطۂ نگاہ سے اسلام کو بطور ارفع مذہب پیش کیا اور بعض آیات کی تعبیر سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مابعد الطبیعیات ،طبیعیات یا مادے اور زمان ومکاں سے متعلق فکری یا تجربی علوم کے نئے انکشافات کی تصدیق قرآن سے کی جاسکتی ہے۔

خطبات کا مطالعہ مختلف جہتوں سے کیا جاسکتا ہے اور اُنھیں تحریر کرنے کی اور وجوہ بھی بیان کی جاسکتی ہیں جس طرح پہلے کہا جاچکا ہے، اگر علامہ اقبال ''اسلام میرے نقطہ نگاہ سے'' یا ''ایک غیر معروف پیغمبر کی کتاب'' لکھنے میں کامیاب ہوجاتے تو یقیناً وہ خطبات تشکیل نو کی توسیع ہوتیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ یہ کام صرف علامہ اقبال خود ہی انجام دے سکتے تھے۔ اس میدان میں اُن کی ''فکر افزا'' مثال نے پہلے کسی کی ہمت نہ بندھائی تو اب کیا بندھائے گی۔ اب علامہ اقبال کے ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' کے موضوع پر کتاب لکھنے کے ارادے کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ''اجتہاد'' کے مطالبے میں علامہ اقبال نے پہل نہیں کی۔ برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی وتمدنی زوال وانتشار کے عالم میں دراصل شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے کو اٹھایا اور اپنے وضع کردہ فقہی اصول ''تلفیق'' کے تحت اہلِ سنت والجماعت فرقے کو اُن کے چار مدرسہ ہائے فقہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) میں سے ہر کسی معاملے میں سب سے سہل راہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ یہ صحیح معنوں میں اجتہاد تو نہ تھا، مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سنیوں کے چاروں فقہی مذاہب کے علماء ایک دوسرے پر کفر کے فتوے صادر کرتے رہے۔ شاید اسی بنا پر بعد میں سرسید احمد خان نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں نے اگر ''تقلید'' کو نہ چھوڑا تو برصغیر میں اسلام کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ علامہ اقبال نے ۱۹۲۴ء میں جب ''اجتہاد'' کے موضوع پر اپنا پہلا خطبہ دیا تو اُن پر کفر کے فتوے لگے تھے۔ بعد ازاں اسی خطبے کو بہتر صورت میں خطباتِ تشکیل نو میں شامل کیا گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے ''اجتہادِ مطلق'' پر اصرار کے اسباب کیا تھے؟

علامہ اقبال نے مسلمانوں کے عالمی دینی، سیاسی، تہذیبی، معاشرتی زوال کی جو وجوہ بیان کی ہیں اُن میں نمایاں تین ہیں: ملوکیت، ملائیت اور خانقاہیت۔ اُن کے خیال میں اسلام کا ''نزول'' اس وقت ہوا جب انسان کی عقلِ استقرائی بالغ ہوچکی تھی اور اُسے نبیوں، مذہبی پیشواؤں اور بادشاہوں جیسے سہاروں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اسلام نے اعلان کیا کہ نبوت ختم ہوگئی۔ اسلام میں پرانے مذاہب کی مانند کسی قسم کی پاپائیت یا مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں۔ مسلمانوں نے ابتدا ہی میں ساسانی اور رومن سلطنتوں کا خاتمہ کر کے ثابت کر دیا کہ ملوکیت کا تعلق عہدِ جاہلیت سے تھا۔ پس بقول علامہ اقبال اسلام کا پیغام سلطانیِ جمہور کا قیام ہے اور یہ کہ اب شعور کی بلوغت کے سبب انسان وحی اور اُس کے احکام کی تعبیر وتشریح خود کرسکتا ہے اور اُس کی بقا اسی میں ہے کہ کرتا رہے۔

علامہ اقبال ''اجتہادِ مطلق'' پر اس لیے بھی زور دیتے ہیں کہ اُن کے مطابق اسلام مسلمانوں کو ''ثبات فی التغیر'' کے اصول پر زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ قرآنی احکام جو عبادات سے متعلق ہیں اُن میں کسی رد وبدل کی گنجائش نہیں، انھیں ثبات حاصل ہے۔ لیکن جن احکام کا تعلق ''معاملات'' سے ہے وہ اصولِ تغیر کے تحت ہیں اور وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق اُن میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ اسی سبب علامہ اقبال کی رائے میں ''اجتہاد'' بطور عمل اسلام کی ابتدا ہی کے ساتھ جاری ہوگیا تھا۔ علامہ اقبال ''اجتہاد'' کی تعریف ''اصولِ حرکت'' کے طور پر کرتے ہیں۔ اس بنا پر فرماتے ہیں کہ جو اجتہادات ماضی میں کیے گئے وہ اپنے اپنے زمانوں کے مطابق درست تھے۔ مگر وہ حال کی ضروریات کے مطابق صحیح قرار نہیں دیے جاسکتے۔ جو کوئی بھی اجتہاد کی تاریخ اور ارتقا کے موضوع پر مستند کتاب لکھنے کا اہل ہوگا، وہ اپنے وقت کا مجدد قرار پائے گا۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ شاید یہ ایک شخص کا کام نہ ہو بلکہ اسے انجام دینے کے لیے فقہاء کا ایک بورڈ قائم کرنا پڑے۔ اور اُس کی تکمیل کے لیے خاصی مدت لگے۔ اگر سوال کیا جائے کہ علامہ اقبال کی سوچ کا ''عطر'' کیا ہے؟ تو اس کا جواب اُن کے جاوید نامہ کے اُن چند اشعار سے دیا جاسکتا ہے، جب وہ خدائے اسلام کے حضور میں کھڑے ہیں اور خداوند تعالیٰ کے منہ ہی سے کہلواتے ہیں:

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست
از جمالِ ما نصیبِ خود نبرد
از نخیلِ زندگانی بر نخورد

(ہر وہ جو تخلیقی سوچ کی قوت نہیں رکھتا، ہمارے نزدیک اصل کافر اور منافق ہے۔ اُس نے ہمارے جمال میں سے اپنا نصیب حاصل نہیں کیا اور وہ زندگانی کے درخت کا پھل کھانے سے محروم رہا۔)

علامہ اقبال کو اس المیے کا بخوبی احساس تھا کہ تحریکِ پاکستان سے پیشتر برصغیر کے

مسلمانوں کی سیاسی تحریکیں، یعنی تحریک (وہابی) مجاہدین اور اُس کے بعد تحریک خلافت، جو اسلام کے نام پر چلیں، اس لیے ناکام ہوئیں کہ اُن کے پیچھے سوچ ''تقلیدی'' تھی۔ تحریکِ پاکستان بھی اسلام ہی کے نام پر چلی، لیکن اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی، اس لیے کہ اُس کے پیچھے سوچ ''اجتہادی'' تھی۔ علامہ اقبال نے ''علاقائی قومیت'' کے مغربی تصور کو ''اسلامی یا مسلم قومیت'' کے تصور کے طور پر پیش کیا یعنی اگر مشترک علاقہ، زبان یا نسل کی بنیاد پر انسانوں کا گروہ ایک قوم بن سکتا ہے تو مشترک روحانی مطمحِ نظر کی بنیاد پر مسلمان ایک قوم کیوں نہیں کہلا سکتے؟ ۱۹۳۰ء میں خطبہ الٰہ آباد میں علامہ اقبال نے ''مسلم قومیت'' کے اسی اصول کی بنیاد پر علیحدہ ''ریاست'' کا مطالبہ کیا۔ اُس سے پیشتر ۱۹۳۰ء میں وہ اپنا خطبہ ''اجتہاد بطور اصولِ حرکت'' دے چکے تھے۔ وفات سے چند روز قبل اسی موضوع پر علامہ اقبال کا مناظرہ دیوبند کے مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ ہوا مولانا کا موقف تھا کہ برصغیر کے مسلمان قوم کے اعتبار سے ہندوستانی ہیں مگر ملت کے اعتبار سے مسلمان۔ علامہ اقبال نے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک ''قوم و ملت'' میں کوئی امتیاز نہیں، دونوں کے ایک ہی معانی ہیں۔ پس بالآخر اسی اجتہادی سوچ کے نتیجے میں برصغیر کے مسلم اکثریتی صوبوں نے پاکستان کو وجود میں لا کر سیاسی و تہذیبی آزادی حاصل کی۔ اگر پاکستان اجتہادی سوچ کا نتیجہ ہے تو اسلامی قانون سازی کے معاملے میں اجتہاد ہی کے ذریعے زندہ رہ سکتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ اقبال آئین کے تحت جمہوری طور پر منتخب پارلیمنٹ (اجماع یا شوریٰ) کو اجتہاد کا حق دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک آئندہ کے مجتہد وہ قانونی ماہرین یا وکلاء ہونے چاہییں جنھوں نے ''اسلامی فقہ'' اور ''جدید جورسپروڈنس'' کے تقابلی مطالعہ کے موضوع پر اعلیٰ تربیت حاصل کی ہو۔ ایسے قانونی ماہرین کسی نہ کسی سیاسی جماعت کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر قانون ساز ادارے یعنی پارلیمنٹ کے رکن بن سکتے ہیں اور اسلامی قانون سازی میں مدد فراہم کر سکتے ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال حکومت کی۔ اس دوران بادشاہوں نے قلعے بنائے تو اپنی حفاظت کے لیے، محل بنائے تو اپنی عیش وعشرت کے لیے، مقبرے بنائے تو اس لیے کہ یاد رکھے جائیں اور مساجد تعمیر کرائیں تاکہ اللہ تعالیٰ اُن کے گناہ معاف کر دے۔ لیکن نہ کوئی دار العدل کی عمارت نظر آئے گی نہ دار العلم کی۔ بادشاہوں کی تاریخ کتب سے ہم اتنا جانتے ہیں کہ فیروز تغلق کے زمانے میں آئینِ فیروز شاہی لاگو ہوا یا اورنگ زیب کے عہد میں فتاویٰ عالمگیری کی روشنی میں انصاف کیا جاتا تھا۔ ایسی کتب جن سے معلوم ہو سکے کہ اس دوران عدل گستری کے لیے نافذ قوانین کی نوعیت کیا تھی؟ اسی طرح ایسی کتب موجود نہیں جو اس دوران ہمیں اپنی تہذیبی ارتقا کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں۔ یعنی کیا اس مسلم دور کے ہندوستانی مدرسوں نے علم الکلام، فلسفہ یا تجربی علوم میں کوئی اہم یا قابلِ ذکر ہستیاں پیدا کیں؟ اگر علامہ اقبال قیامِ پاکستان کے بعد زندہ رہتے تو ایسے سب میدانوں میں تحقیق کی ضرورت پر زور دیتے۔

اب قائداعظم کے نام علامہ اقبال کے خط میں ''فلاحی ریاست کے قرآنی تصور'' کے بارے میں غور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس موضوع پر کوئی مستند مقالہ یا خطبہ تو تحریر نہیں کیا، شعر و نثر میں چند اشارے موجود ہیں۔ البتہ وہ مارکسزم، کمیونزم یا اشتراکیت کے اتنے ہی خلاف تھے جتنے کیپیٹلزم، سرمایہ داری یا جاگیرداری کے۔ اُن کے خیال میں انسانی بہبود یا فلاح کا ہر وہ نظام جو روحانیت سے عاری ہو، انسان کے لیے صحیح سکون و اطمینان کا باعث نہیں بن سکتا۔ شاید اسی بنا پر انھوں نے خطبات میں شامل اپنے خطبہ ''اجتہاد'' میں فرمایا کہ اسلام کا اصل مقصد ''روحانی'' جمہوریت کا قیام ہے۔ علاوہ اس کے پیش گوئی کی تھی کہ سویٹ روس میں کمیونزم بطور نظام ختم ہو جائے گا، جو بالآخر درست ثابت ہوئی۔ مغربی تہذیب کے روحانیت سے عاری سرمایہ دارانہ نظام کے استبداد کے بارے میں بھی وہ سمجھتے تھے کہ شاخِ نازک پر بنا یہ آشیانہ ناپائیدار ہو گا۔ علامہ اقبال کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ سرمایہ اور محنت کے درمیان توازن کو اسلامی نظامِ معیشت قرار دیتے ہوئے اُسے ''اقتصاد'' کا نام دیتے ہیں یعنی درمیانے طبقے کی فلاحی ریاست۔ بہرحال یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ علامہ اقبال نے ابتدائی زمانہ میں ''پولیٹیکل اکانومی'' پر کتابچہ تحریر کیا اور قیامِ انگلستان کے دوران ''اکانومکس'' کی کلاسوں میں بھی شریک ہوتے رہے، وہ صحیح معنوں میں تربیت یافتہ اکانومسٹ یا اقتصادیات کے ماہر نہ تھے۔

۱۹۲۶ء میں علامہ اقبال پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ اُس زمانہ میں ''انڈسٹری'' کے میدان میں تو مسلمانوں کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ البتہ ''جاگیرداری'' کا مسئلہ تھا۔ لہٰذا اس موضوع پر کونسل میں اُن کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کو زمین کا مالک سمجھتے تھے۔ یعنی اُن کے نزدیک چار بنیادی عنصر جن سے کائنات تشکیل کی گئی۔ آگ، پانی، ہوا اور زمین، سب خدا کی ملکیت ہیں۔ لہٰذا انسان اصولی طور پر زمین کا مالک نہیں، محض ''ٹرسٹی'' ہے تاکہ اُس کے ذریعے روزی کما سکے۔ اس اصول کا اطلاق وہ ''کراؤن'' یا ''سٹیٹ'' پر بھی کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ''کراؤن'' (اسٹیٹ) کے تصرف میں جو اراضی ہے وہ آسان قسطوں پر بے زمین کاشتکاروں میں بانٹ دی جائے۔ نیز جاگیردار کے پاس اتنی اراضی رہنے دی جائے جو وہ خود کاشت کرتا ہو۔ گویا علامہ اقبال جاگیردار کے ''ٹینینٹ'' سے ''بٹائی'' (مخابرہ) لینے کے بھی خلاف تھے۔ اسی طرح اُس زمانہ میں بڑے زمینداروں پر ''ایگریکلچرل'' ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی جو ٹیکس عشر اور زکاۃ کی وصولی کے علاوہ تھا۔ علامہ اقبال مسلم جاگیرداروں پر اسلامی قانونِ وراثت کے سختی کے ساتھ اطلاق سے بھی سمجھتے تھے کہ یوں چند نسلیں گزرنے کے بعد جاگیرداری کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ علامہ اقبال ''لینڈ ریفارم'' کے بارے میں مخصوص نظریہ رکھتے تھے۔

تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو مسلم معاشرہ کی معیشت کی بنیادیں دراصل ابتدا ہی سے ''فیوڈل'' (جاگیرداری) نظام پر قائم ہونے کی بجائے ''مرکنٹائیل'' (تجارتی) نظام پر قائم تھیں۔ اسی لیے اسلامی فقہ میں ''مال'' سے مراد ''سرمایہ'' (ولتھ) بھی ہے اور ''اراضی'' (اسٹیٹ) بھی۔ نیز تجارت کے ذریعے پیداوار بڑھانا یا منافع کمانا اخلاقی طور پر عمدہ اسلامی خصائل سمجھے جاتے تھے۔ ''تجارتی معیشت'' (مارکیٹ اکانومی) کے لیے ''سرمایہ'' کی فراہمی کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ اس لیے اگرچہ اسلامی قانون کے مطابق ربوٰ حرام ہے، لیکن ایسے لین دین کو مختلف ''حیلوں'' کے ذریعے جاری رکھا گیا۔ بقول ناصر خسرو گیارہویں صدی اصفہان میں ''تبادلہ سرمایہ'' (منی ایکسچینج) کی خاطر دو سو کے قریب کاروباری ادارے موجود تھے یہی کاروبار کرتے تھے۔ علامہ اقبال معاشرہ میں ''سرمایہ'' (کیپٹل) کی قوت کو بالکل ختم کرنا نہیں چاہتے بلکہ ''مارکیٹ اکانومی'' کے فروغ کے لیے اس کی موجودگی کو اہم خیال کرتے ہیں۔ اسی سبب مولانا شبلی کی طرح بنک کے سود کو ''منافع'' قرار دیتے ہیں کیوں کہ اس میں استحصال کا ویسا امکان نہیں جو ربوٰ کی وصولی میں ہے۔

پرانے زمانے کی اسلامی ریاست کی آمدنی کے ذرائع مختصراً یہ تھے: ذمیوں سے ''جزیہ'' اور اگر اراضی کے مالک ہوں تو ''خراج'' کی وصولی۔ غنیمہ۔ مسلمانوں سے، اگر اراضی کے مالک ہوں تو ''عشر'' اور اُس کے علاوہ ''زکاۃ'' کی وصولی (اگر رضا کارانہ طور پر ادا نہ کی گئی ہو تو)۔ ریاست کو ''تجارتی معیشت'' کے ذریعے منافع پر مختلف نوعیت کے ٹکسوں کی آمدنی بھی ہوتی تھی۔ معاشیات کے بارے میں تحریر کرنے والوں میں امام ابو یوسف کی کتاب الخراج معروف ہے۔ مگر ابن خلدون، البیرونی، ابن تیمیہ، ناصر طوسی، ابن مسکویہ اور اخوان الصفا نے بھی اپنی کتاب میں ایسے مسائل پر بحث کی ہے۔

جہاں تک انسان کے بنیادی حقوق کا تعلق ہے، قرآن کی سورۃ طٰہٰ آیات ۱۱۹،۱۱۸ میں اللہ تعالیٰ آدم سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: اے آدم، تمہارے لیے یہاں انتظام ہے۔ نہ بھوکے ننگے رہو گے، نہ گرمی تمھیں ستائے گی۔'' ان آیات کے ساتھ اگر ترمذی کی بیان کردہ حدیث پڑھی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کیا: آدم کے بیٹے کے تین حقوق ہیں، رہنے کو مکان، ننگا پن چھپانے کو کپڑا اور کھانے پینے کو روٹی اور پانی'' تو اسلامی فلاحی ریاست کے ارباب بست وکشاد پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ہر شہری کو یہ سہولتیں فراہم کریں۔ اور اب تو اُن میں دو مزید حقوق، یعنی بلا معاوضہ تعلیم اور مفت طبی امداد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ علامہ اقبال خاندانی منصوبہ بندی کے اس طرح قائل تھے کہ اگر بیوی اولاد پیدا نہ کرنا چاہے تو خاوند اُسے مجبور نہیں کر سکتا۔

علامہ اقبال جب قائد اعظم کو اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ اسلامی قانون کے طویل مطالعے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کی ''جدید نظریات'' کی روشنی میں ارتقا کے ذریعے قابل قبول ''سوشل ڈیماکریسی'' قائم کی جا سکتی ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے: وہ اپنے اس دعویٰ کی بنیاد کن قرآنی آیات پر استوار کرتے ہیں، عین ممکن ہے انھوں نے فلاحی ریاست کے قرآنی تصور کی بنیاد سورۃ البقرہ آیت ۲۱۹ اور سورۃ الذاریات آیت ۱۹ پر رکھی ہو۔ سورۃ البقرہ آیت ۲۱۹ میں حکم ہے: ''پوچھتے ہیں اللہ کی راہ میں کیا خرچ کیا جائے؟ قل العفو (کہو جو ضرورت سے زاید ہے)!!'' اس ضمن میں علامہ اقبال کے اشعار قابل غور ہیں:

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدّت کردار

جو حرف ''قل العفو'' میں پوشیدہ ہے اب تک　　اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

''قل العفو'' کے بارے میں ''تقلیدی'' سوچ تو یہی ہے کہ انسان رضا کارانہ طور پر جو اپنی ضرورت سے زاید یا فالتو سمجھے خدا کی راہ میں دے دے۔ مگر ''جدت کردار'' سے علامہ اقبال کی کیا مراد ہے؟ کیا یہ طے کرنے کے لیے کہ ضرورت سے زاید یا فالتو کیا ہے، ریاست کی مداخلت ضروری ہے؟ سورۃ الذاریات آیت ۱۹ میں ارشاد ہوتا ہے ''دولت مندوں کے مال میں ناداروں اور محروموں کا حصہ ہے۔'' کیا علامہ اقبال کے نزدیک اس حصے کا تعین کرنے کی خاطر بھی ریاست کی مداخلت ضروری ہے؟ علامہ اقبال کے ارشادات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے بنیادی حقوق کے قرآنی تصور اور دولت مندوں کی ذمہ داری سے متعلق قرآنی احکام کے تحت ''روحانی'' بنیادوں پر قائم ''سوشل ڈیماکریسی'' یا ''اسلامی فلاحی ریاست'' وجود میں لائی جا سکتی ہے۔

بہر حال خصوصی طور پر ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' اور ''فلاحی ریاست کا قرآنی تصور'' کے موضوعات پر کتب تحریر کرنا ایسے کام تھے جو علامہ اقبال تو ادھورے چھوڑ گئے مگر علامہ اقبال کے نام پر قائم سرکاری یا غیر سرکاری ادارے انجام دے سکتے ہیں۔ یہی امید ہمیں اس ادارے سے رکھنی چاہیے جو میاں اقبال صلاح الدین اور اُن کے رفقاء نے علامہ اقبال کے نام پر قائم کیا ہے۔ شاید ''اجتہاد کی تاریخ وارتقا'' پر کوئی مستند کتاب تحریر کرنے کی خاطر علماء وفقہاء کا بورڈ قائم کرنے کی ضرورت پڑے۔ اسی طرح ''فلاحی ریاست کا قرآنی تصور'' کے موضوع پر کچھ تحریر کرنے کی خاطر ماہرین اقتصادیات کی خدمات حاصل کرنی پڑیں۔ علامہ اقبال احیائے اسلام کے شاعر ہیں۔ انھوں نے فرمار کھا ہے کہ وہ ''حرف آخر'' نہیں۔ اگر اُن کا شروع کردہ عمل احیا واقعی جاری ہے تو بقول اُن کے، اُن کے پیش کردہ نظریات سے بہتر نظریات سامنے آسکتے ہیں ضرورت صرف اُن کے اس شعر کو ملحوظ خاطر رکھنے کی ہے:

ہر کہ او را قوّت تخلیق نیست

پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

❀❀❀

مسلم تاریخ کے کچھ دلچسپ گوشے

تحریر: ڈاکٹر ساجد علی

ہمارے ہاں کچھ حلقوں کی جانب سے ایک شکوہ بہت عام ہے کہ ہمیں غلط تاریخ پڑھائی جا رہی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح تاریخ کیا ہوتی ہے؟ تاریخ گزشتہ ادوار میں پیش آنے والے وقوعات و حادثات کا بیان ہے۔ اگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کئی صدیوں پیشتر کوئی واقعہ در حقیقت کس طرح پیش آیا تھا تو یہ جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ ہماری مجبوری ہے کہ ہم ان بیانات پر انحصار کریں جو مورخین نے اپنی کتابوں میں بیان کیے ہیں۔ تاہم آنکھیں بند کر کے ان مورخین پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ کتب تاریخ میں مذہبی، ریاستی، نسلی، نظریاتی اور قومی تعصبات کا غلبہ رہا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم کسی کتاب کو پڑھتے ہوئے کچھ سوالات پوچھیں۔ اگر مورخ بیان کرتا ہے کہ فلاں واقعہ اس طرح رونما ہوا تھا تو ہم پوچھ سکتے ہیں کہ آیا ممکنہ طور پر کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔

تاریخ کے مطالعے میں ایک اور دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اس میں بالعموم فاتح کا ورشن ہی پڑھنے کو ملتا ہے۔ اگر ہم سرزمین ہند پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے باسیوں نے کبھی تاریخ نگاری کی ہی نہیں تھی۔ سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا لیکن ہمیں کسی تاریخ میں ہندوستان کا نقطہ نظر نہیں ملتا۔ آج کل کچھ لوگ بہت بلند آواز سے دعویٰ کرتے ہیں کہ در اصل پورس نے سکندر کو شکست دی تھی۔ اس بات کی تائید میں لیکن ہمیں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ سکندر کو شکست ہونا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ تاہم اس کو جاننے کے لیے کچھ واقعاتی شواہد پر انحصار کرنا پڑے گا۔ جس فوج کو شکست ہو وہ واپس بھاگتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اسے شکست تو ہو جائے لیکن اس کی پیش قدمی جاری رہے۔ اب اگر تو یونانی افواج شکست کھا کر پنڈی کی طرف بھاگ گئی تھیں تو ہم یہ بات تسلیم کر سکتے ہیں کہ انھیں شکست ہوئی تھی۔ لیکن اگر یونانی افواج جہلم دریا عبور کر کے آگے بڑھی تھیں تو پھر اس دعوے کو تسلیم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ مزید براں سکندر کے بعد کئی صدیوں تک اس علاقے میں یونانی سلطنت بھی قائم رہی تھی۔

مسلمانوں کا بازنطینی سلطنت کے ساتھ تقریباً آٹھ صدیوں تک محاذ گرم رہا ہے۔ اس تاریخ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دونوں اطراف کا لکھا ہوا مواد دستیاب ہے جس کی بنا پر تقابلی مطالعہ ممکن ہے۔ اگر ایک واقعہ کا مسلم اور رومی دونوں تاریخوں میں ذکر ملتا ہے تو ہم کافی وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ واقعہ رونما ہوا ہوگا۔ غلام احمد پرویز صاحب کا ابتدائی مسلم تاریخ کے بارے میں یہ موقف تھا کہ تمام صحابہ کو قرآن حکیم نے چونکہ یہ سرٹیفکیٹ عطا کیا ہوا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، اس بنا پر وہ تمام واقعات جعلی شمار ہوں گے جو صحابہ کے مابین مناقشات یا محاربات کو بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ بالا سرٹیفکیٹ کی روشنی میں ان نفوس قدسیہ سے ان واقعات کا صدور محال ہے۔ لیکن اگر رومن تاریخ بھی حضرت عثمانؓ کی شہادت کا ذکر کر رہی ہو، اسی طرح اس میں جنگ جمل، جنگ صفین، واقعہ کربلا اور عبداللہؓ بن زبیرؓ کی شہادت کا ذکر ملتا ہو تو پھر ان واقعات کے وضعی ہونے پر یقین کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ تاریخی واقعات کے متعلق افراد کے تقویٰ یا تقدیس کے حوالے سے فیصلہ کرنا اتنا آسان نہیں۔ ایک اہم اصول یہ ہے کہ کسی مشہور تاریخی واقعے کی تردید کی خاطر بہت قوی شواہد درکار ہوتے ہیں، اسے محض خیال آرائی سے رد کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

ہمارے وہ مورخین جو تاریخ کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں ان کے لیے اس دور کے واقعات کی توجیہ بیان کرنا بہت مشکل ہوتا ہے جسے فتنہ اولیٰ یا کبریٰ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد امیر معاویہؓ کے تخت حکومت پر فائز ہونے تک پانچ سال کا عرصہ خانہ جنگی کا ہے۔ ان جنگوں میں جاں بحق ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ ان کی اتنی سی توجیہ قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ دو نیک نیت اور متقی فریقوں کے مابین محض غلط فہمی اور چند افراد کی فتنہ انگیزی کے سبب برپا ہو گئی تھیں۔ ان جنگوں کا ایک اہم پہلو اور بھی ہے جسے عام طور پر تاریخوں میں نظر انداز کیا گیا ہے یا بہت سرسری طور پر بیان کیا گیا ہے۔

جب مسلمان باہم برسرپیکار تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت رومی سلطنت والے کیا کر رہے تھے۔ وہ ابھی اتنے کمزور نہیں ہوئے تھے کہ اس صورت حال کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرتے۔ طرفین کی تحریروں کے تقابلی مطالعے سے اس سوال کا جواب حاصل کرنے میں کسی قدر آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہمارے تاریخ نگاروں کو بھی اس سوال کی اہمیت کا احساس رہا ہے چنانچہ انھوں نے اس خلا کو پر کرنے کی کافی سعی کی ہے۔ تاریخی کتب میں اس امر کا ذکر ملتا ہے کہ قیصر روم اپنی فوجوں کو آگے بڑھا لایا تھا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ زمانہ جدید کے مورخین جو صدر اول کے مسلمانوں کو تقدیس کے اعلیٰ مراتب پر فائز دیکھتے ہیں وہ لازم سمجھتے ہیں کہ اس دور کے کسی فرد پر وارد ہونے والے اعتراض کا جواب مہیا کریں۔ اس کی ایک مثال ہمیں اکبر شاہ خان نجیب آبادی کی مشہور کتاب "تاریخ اسلام" میں ملتی ہے۔ اس صورت حال کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں، "جب حضرت علی اور امیر معاویہ کے مابین جنگ کا بازار گرم تھا اور قیصر روم نے شمالی ایران کے علاقوں پر حملہ کرنے کا سوچا تو امیر معاویہ نے اسے خط لکھا: ہماری آپس کی لڑائی تم کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اگر تم نے علی کی طرف رخ کیا تو علی کے جھنڈے کے نیچے سب سے پہلا سردار جو تمھاری گوشمالی کے لیے آگے بڑھے گا وہ معاویہ ہو گا۔" (جلد اول، ص ۶۶۰)

فاضل مصنف نے کوئی حوالہ نہیں دیا کہ یہ خط انہیں کس کتاب میں ملا ہے۔ قیصر روم کا شام کے قریبی علاقوں کو چھوڑ کر شمالی ایران پر حملہ کرنے کا ارادہ قرین قیاس دکھائی نہیں دیتا کیونکہ دونوں میں جغرافیائی بعد تھا اور آرمینیا کے اکثر علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ اس کے برعکس ندوہ سے شائع ہونے والی شاہ معین الدین ندوی کی تاریخ اسلام میں ابو حنیفہ دینوری کی الاخبار الطوال کے حوالے سے یہ واقعہ کچھ اس طرح بیان ہوا ہے: جب حضرت علی سے جنگ تقریباً یقینی ہو گئی تھی اس وقت رومی بھی سواحل شام پر فوجیں جمع کر رہے تھے۔ امیر معاویہ کو عمرو بن العاص نے یہ مشورہ دیا قیصر روم کے قیدیوں کو چھوڑ کر اس سے صلح کر لو، اس شرط پر وہ فوراً آمادہ ہو جائے گا (حصہ اول، ص ۲۳۶)۔ البتہ اس مورخ نے بھی یہ بتانا پسند نہیں کیا کہ اس مشورے کا نتیجہ کیا تھا۔ آیا قیصر روم نے بس اتنی سی بات پر صلح کر لی تھی یا کچھ اور تقاضا بھی کیا تھا؟

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ایک ملتا جلتا واقعہ نقل کیا ہے: جب شاہ روم نے حضرت معاویہ کو حضرت علی سے مصروف پیکار پایا تو وہ عظیم فوجوں کے ساتھ ملک کے بعض حصوں کے قریب آ گیا اور ان میں دل چسپی لینے لگا تو حضرت معاویہ نے اسے لکھا: خدا کی قسم! اگر تو باز نہ آیا اور اے لعین! تو اپنے ملک کو واپس نہ گیا تو میں اور میرا عم زاد آپس میں مصالحت کر لیں گے اور ہم تجھے تیرے ملک سے نکال دیں گے اور زمین کو باوجود فراخی کے تجھ پر تنگ کر دیں گے۔ اس موقع پر شاہ روم خوف زدہ ہو کر واپس چلا گیا اور مصالحت کا طلب گار ہو کر پیغام بھیجا۔ (تاریخ ابن کثیر۔ اردو ترجمہ۔ حصہ ہشتم، ص ۴۵۴)

تاہم رومی وقائع نگار (Theophanes) نے یہ واقعہ کچھ یوں بیان کیا۔ ۶۵۹ء میں حضرت معاویہ نے قیصر روم کے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ مسلمان ایک ہزار طلائی سکے، ایک غلام اور ایک گھوڑا روزانہ کے حساب سے رومیوں کو خراج ادا کریں گے۔ (یہاں nomismata کا لفظ استعمال ہوا ہے، ابن خلدون نے اسے دینار کہا ہے) اپنی وفات سے ایک سال قبل بھی امیر معاویہ نے رومیوں کو سالانہ دو لاکھ سولہ ہزار طلائی سکے، پچاس گھوڑے اور پچاس غلام ادا کرنے کی شرائط پر صلح کا معاہدہ کیا تھا۔ خالد یحییٰ بلینکن شپ نے اپنی کتاب (The End of the Jihad State) میں ان معاہدات کا ذکر کرتے ہوئے دو مسلمان مورخین الیعقوبی اور ابن خیاط کی کتابوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ غور کیا جائے تو ان مسلمان مورخین اور رومی وقائع نگار کا بیان زیادہ قرین قیاس دکھائی دیتا ہے کہ فریقین کے مابین کوئی صلح کا معاہدہ ہوا تھا۔ ظاہر سی بات ہے کوئی بھی زیرک اور فہیم کمانڈر دو محاذوں پر بیک وقت لڑنا پسند نہیں کرے گا۔ ایک محاذ کو سرد رکھنا اور اپنے عقب کی حفاظت کرنا اس کی مجبوری ہے۔

اس کے بعد جب عبد الملک خلیفہ بنا تو اس وقت حجاز پر حضرت عبد اللہ بن زبیر کا قبضہ تھا، عراق میں مختار ثقفی نے شورش برپا کی ہوئی تھی۔ مشرقی محاذ پر جنگ کرنے کے لیے اس نے مصلحت جانی کہ مغربی محاذ پر موجود دشمن سے صلح کر لی جائے۔ رومی وقائع نگار کے مطابق، چنانچہ اس نے ۶۸۵ء میں قیصر روم سے انھی شرائط پر معاہدہ صلح کیا تھا جن پر حضرت معاویہ نے پہلا معاہدہ کیا تھا۔ لیکن خراج کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ اس کے لیے ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے اگلے ہی برس اس معاہدے کی تجدید کی گئی اور ایک غلام اور ایک گھوڑا روزانہ دینے کی شرط ہٹا دی گئی۔ اس کے باوجود اتنی بڑی رقم ادا کرنا ممکن نہ تھا، لہٰذا تین برس بعد رومی پھر فوجیں لے کر آ گئے تو اس وقت ہونے والے معاہدے میں خراج کی رقم گھٹا کر ہفتہ وار ایک ہزار طلائی سکے کر دی گئی۔ اس معاہدے کا ذکر ابن خلدون ان الفاظ میں کرتا ہے، "عہد عبد الملک میں جس وقت آپس کی نااتفاقی حد سے متجاوز ہو گئی تھی، رومیوں نے موقع پا کر مسلمانان شام پر لشکر کشی کر دی تھی۔ عبد الملک نے والی قسطنطنیہ سے دب کر اس شرط پر مصالحت کر لی تھی کہ ہر جمعہ کو ایک ہزار دینار ادا کرے گا۔ یہ واقعہ ۷۰ ہجری کا ہے۔" ابن خلدون نے جس برس کا ذکر کیا ہے اس وقت ابھی مذکورہ بالا خانہ جنگی جاری تھی۔

اگر ہم ابن کثیر اور ابن خلدون کی تواریخ کا تقابلی مطالعہ کریں تو عجیب و غریب صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ابن کثیر نے تاریخ لکھتے وقت، بالخصوص صدر اول کی تاریخ میں، روایات پر انحصار کیا ہے۔ ہر واقعے اور ہر سانحے کے لیے پہلے سے ایک پیش گوئی موجود ہے۔ اس نے حضرت علی کا یہ قول ابو داؤد کے حوالے سے نقل کیا ہے: زمین پر جو کچھ ہوتا ہے پہلے آسمان پر اس کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے۔ ان روایات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ صحابہ کرام کے مابین جو جنگ و جدل ہوا وہ مشیت کا فیصلہ تھا، اس کی کسی پر ذمے داری عائد نہیں کی جا سکتی۔ اس کے برعکس ابن خلدون واقعات کو بڑی حد تک معروضی اور غیر جذباتی انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ شاذ ہی کسی روایت کا سہارا لیتا ہے۔ بالعموم انھی واقعات کو بیان کرتا ہے جو قرین قیاس ہوتے ہیں۔ البتہ بنی امیہ کی طرف اس کی جانب داری بہت واضح ہے۔

یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ ہمارے مورخین نے واقعات کو ریکارڈ ضرور کیا ہے لیکن ان کے تحلیل و تجزیے کی زحمت کم ہی اٹھائی ہے۔ یہ وہ کام ہے جس کی اشد ضرورت ہے تا کہ ہمارا تاریخی فہم درست بنیادوں پر استوار ہو سکے اور ہم واقعات کا درست تناظر میں جائزہ لے سکیں۔ ❁❁❁

علامہ شبلی نعمانی

تحریر: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ ۴؍جون ۱۸۵۷ء کو موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ کے نامور وکیل اور شعر وادب کے بڑے اداشناس تھے۔ رفاہ عام کے کاموں میں بھی آگے بڑھ کر حصہ لیتے، تصوف کے بھی ذوق آشنا تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے بچوں کے نام شبلی وجنید رکھے اور علم دین کی تعلیم دلائی، علامہ شبلی ان کے بڑے بیٹے تھے، انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، پھر مولوی عبداللہ جیراج پوری سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد یہ چشمہ رحمت غازی پور میں داخل ہوئے، اسی زمانہ میں ان کے والد نے اعظم گڑھ شہر میں مدرسہ عربیہ قائم کیا تو وہ اس میں آگئے، بعد ازاں مولانا فاروق چریاکوٹی کو ان کے مدرسہ عربیہ میں استاذ مقرر کر دیا۔ چنانچہ اسی مدرسہ میں انھوں نے تعلیم کی تکمیل کی، پھر مختلف علوم وفنون میں مہارت پیدا کرنے کے لیے مثلاً فقہ کی تحصیل کے لیے مولانا ارشاد حسین رام پوری، ادب کے لیے مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور حدیث کے لیے مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، اسی زمانہ میں ان کے والد اور خانوادے کے دیگر افراد حج کے لیے جارہے تھے، چنانچہ انھوں بھی رخت سفر باندھا اور تعلیم کے بعد سب سے پہلے اللہ کے گھر کی زیارت کی، وہاں بھی ان کا ذوقِ علم ومطالعہ غالب رہا اور انھوں نے مدینہ منورہ کی کتب خانوں سے استفادہ کیا۔

حج کے بعد انھوں نے اعظم گڑھ میں مختلف مشاغل اختیار کئے، کچھ دن امین رہے، پھر وکالت کا امتحان پاس کر کے اعظم گڑھ دستی میں وکالت کی لیکن ان سب کاموں میں ان کا جی نہ لگا اور ان میں وہ ناکام رہے۔

ان کے والد شیخ حبیب اللہ علی گڑھ تحریک کے ابتدائی ہم نوا لوگوں میں سے تھے سرسید نے اعظم گڑھ کا سفر کیا تو وہ ان کے ساتھ رہے، کالج کی مالی معاونت کی، بعض عمارتوں کی تعمیر میں بھی انھوں نے حصہ لیا، سرسید نے پٹریاٹک سوسائٹی قائم کی تو انھیں اعظم گڑھ کا کرسپاڈنگ رکن مقرر کیا۔ اسی تعلق کی بنا پر انھوں نے تمام بچوں، بھتیجوں اور قرب وجوار کے طلبہ کو علی گڑھ میں داخل کرایا، ان کے دوسرے بیٹے مہدی حسن جو حفظ قرآن مکمل کر چکے تھے انھیں انگریزی تعلیم دلائی اور علی گڑھ بھیجا، وہ علی گڑھ کے ابتدائی طلبہ میں سے تھے، چنانچہ علی گڑھ سے ایف اے کرنے کے بعد وہ بیرسٹری کے لیے لندن گئے، منجھلے بیٹے محمد اسحاق نے بھی علی گڑھ سے بی اے کیا اور وکالت پاس کر کے الہ آباد کے نامور وکیل ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں شیخ صاحب بچوں سے ملنے علی گڑھ گئے تو شبلی کو بھی ساتھ لے گئے، اس دور میں شبلی کے دل میں سرسید کا کتنا احترام رہا ہوگا کہ وہ علی گڑھ آئے تو خالی ہاتھ نہیں آئے، سرسید کی مدح میں عربی میں قصیدہ کہہ کر ساتھ لائے اور پیش کیا، جسے سرسید نے بہت پسند کیا اور شیخ صاحب کی آمد، کالج کے معائنہ اور اس قصیدہ کا ذکر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں کیا اور قصیدہ کو بھی شائع کیا۔ اس قصیدہ میں شبلی نے سرسید کے لیے جن جذبات کا اظہار کیا ہے اور جیسا ان کا سراپا کھینچا ہے وہ بے حد اہمیت رکھتا ہے، خاص طور پر اس پس منظر میں کہ اس وقت تک شبلی جدید دنیا سے ناواقف تھے، بہر حال شبلی کی سرسید سے یہ پہلی ملاقات تھی۔

علی گڑھ جانے سے پہلے اعظم گڑھ میں شبلی کی مشغولیات بھی متنوع تھیں وہ کبھی شعر وشاعری کی محفل سجاتے ہیں، کبھی طلبہ کو درس دیتے، شدید حنفیت کے زیر اثر گھوڑے پر سوار ہو کر اہل حدیث علماء سے مناظرے کرتے ہیں۔ ان کی ابتدائی تصنیفات اسکات المعتدی اور رسالہ ظل الغمام اسی مناظرانہ شغل کی دین ہیں۔

کتب بینی اور مطالعہ کا شوق انھیں بچپن سے تھا، اعظم گڑھ کے کتب فروشوں کی دکانوں پر کھڑے ہو کر وہ کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے اور اپنے احباب سے کتابیں حاصل کر کے ان کا مطالعہ کرلیتے، غرض علم ومطالعہ کے وہ بڑے شائق تھے مگر اس وقت تک ان کی فکر ونظر کا میدان حنفیت کی تبلیغ واشاعت تھا۔

۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج میں فارسی کی جگہ نکلی تو وہ اپنے استاذ مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے سفارشی خط کے ساتھ اس کے امیدوار ہوئے۔ چنانچہ ان کا انٹرویو اس طرح ہوا کہ سرسید کے کتب خانہ میں انھیں بلایا گیا وہ آئے تو کتابیں دیکھ کر جو الماریوں میں بند تھیں الماریوں کا چکر لگاتے رہے، ان سے کہا گیا کہ اب انٹرویو کل ہوگا۔ دوسرے دن آئے تو الماریاں کھلی ہوئی تھیں چنانچہ وہ الماریوں سے کتابیں نکال نکال کر دیکھتے رہے، پھر ان سے کہا گیا کہ انٹرویو کل ہوگا۔ تیسرے دن وہ آئے تو کتب خانہ میں کرسی اور میز بھی موجود تھی، چنانچہ وہ الماریوں سے کتابیں نکال کر مطالعہ میں منہمک ہوگئے، اسی اثناء میں سرسید احمد خاں تشریف لائے اور ان کے ذوق مطالعہ کو دیکھ کر ان کے تقرر کی خوش خبری سُنائی گویا ان کے بڑھے ہوئے ذوق مطالعہ نے انھیں علی گڑھ سے وابستہ کر دیا اور اب انھیں بھی اندازہ ہوا کہ سرسید کس قدر جویائے علم اور دانائے راز تھے، چنانچہ فروری ۱۸۸۳ء سے وہ علی گڑھ کالج سے وابستہ ہوئے۔ یہاں آئے تو سرسید کے کتب خانہ، سرسید کی صحبت اور پروفیسر آرنلڈ سے تبادلہ خیالات نے ان کے ذوق ونظر کی دنیا ہی بدل دی، اس وقت کالج نئے علوم وافکار بلکہ جدید دنیا کا ایک اہم مرکز تھا۔

یہاں کے قیام نے شبلی کی دنیا ہی بدل دی جس کا خود انھوں نے بارہا اعتراف کیا ہے، پہلے

وہ کالج سے باہر رہتے تھے، سرسید نے انھیں اپنے قریب بلا کر ایک بنگلیہ میں قیام کرنے کا موقع دیا، جسے عرف عام میں شبلی کی بنگلیہ کہا جاتا تھا، اس طرح ان کا اور سرسید کا شب و روز کا ساتھ ہوا تو شبلی سرسید کی زبان بولنے لگے، سرسید اور علی گڑھ تحریک کی حمایت میں انھوں نے ۱۸۸۵ء میں مثنوی صبح امید لکھی اس میں انھوں نے سرسید کا جو سراپا کھینچا ہے، اور علی گڑھ تحریک کی جس قدر تعریف و توصیف کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ بڑی بڑی کتابوں سے بھی نہ ہوسکی۔

اس زمانہ میں سرسید ایجوکیشنل کانفرنس قائم کر چکے تھے، اس کے دوسرے اجلاس میں شبلی نے شرکت کی اور سرسید کی خواہش پر ”مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم“ کے موضوع پر مقالہ پیش کیا، یہ مقالہ لکھنؤ کی شاہی بارہ دری میں سرسید کی موجودگی میں پیش کیا گیا، جب یہ مقالہ پیش کیا جا رہا تھا اس وقت کے امراء اور رؤساء و الیانِ ریاست اور جدید علوم وفنون کے شیدائی موجود تھے اور لوگ اُٹھ اُٹھ کر پوچھتے تھے کیا مولانا ہمارا ماضی ایسا ہی شاندار تھا، جیسا کہ آپ بیان کر رہے ہیں؟ شبلی نے اس مقالہ میں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، قدیم مدارس، دار العلوم اور اس کی ترقیوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے، سرسید نے اس رسالہ کو بے حد پسند کیا اور مدرسۃ العلوم کی طرف سے شائع کیا۔

یہاں آکر شبلی کے خیالات اور غور وفکر کا محور بدل گیا اور انھیں معلوم ہوا کہ اسلام اور شعائر اسلام پر کس قسم کے اعتراضات ہیں اور اسلام کی سچی خدمت کا میدان کیا ہے، یہیں وہ سرسید کی صحبت اور پروفیسر آرنلڈ کی رفاقت میں مستشرقین سے اور ان کے اسلام پر اعتراضات سے واقف ہوئے، چنانچہ انھوں نے رسالہ کتب خانہ اسکندریہ لکھا جس میں انھوں نے مسلمانوں پر عائد اس الزام کا کہ کتب خانہ اسکندریہ مسلمانوں نے برباد کیا اور مسلمان علم کے دشمن تھے، بڑا مدلل جواب لکھا اور ثابت کیا کہ یہ محض الزام ہے، حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں اور کتب خانہ اسکندریہ خود عیسائیوں نے جلایا اور اس کے جلانے میں ان کے مذہبی رہنما شریک تھے۔ اس محققانہ مقالہ نے اہل علم کو بے حد متاثر کیا اور اس سے مغربی اہل قلم کے نقطہ نظر میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ الجزیہ اور حقوق الذمیین بھی ان کے اسی نوع کی تحقیقات کے نمونے ہیں، الجزیہ کا سرسید نے انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع کیا اور اس کی وہ بے حد تعریف کرتے تھے۔

یہاں علی گڑھ کی فضا میں انھوں نے درس وتدریس کے ساتھ شعر وسخن کا بھی سلسلہ جاری رکھا، کالج کی خاص خاص مجالس میں وہ شریک ہوتے، قصائد پیش کرتے، خاص طور پر کالج میں کوئی مہمان آتا تو اس کے منظوم استقبال اور قصائد پیش کر کے کالج کی ادبی فضا اور اس کے وقار میں اضافہ کرتے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک وہ کالج سے وابستہ رہے، ان میں بیشتر تخلیقات کو سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا ہے۔

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم جو ان کے جدید دور تصنیف اور تحقیق کی پہلی کاوش ہے کے بعد ۱۸۸۷ء میں خلیفہ مامون کی سوانح اور تاریخ المامون لکھی۔ ان کی یہ تصنیف بھی بے حد مقبول ہوئی، اور کالج کی طرف سے شائع ہوئی، ۱۸۸۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن سرسید کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا۔ اس میں سرسید نے اپنے سے چالیس سال چھوٹے علامہ شبلی کی جس قدر تعریف وتحسین کی ہے وہ مثالی ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کس درجہ بلند رتبہ شخص تھے۔ انھوں نے شبلی کے مورخانہ حیثیت کی داد دی، ان کے وسعت مطالعہ کو سراہا، خاص طور پر حوالہ اور ماخذ کے اہتمام کی تحسین کی اور شبلی کے اسلوب نگارش کی ایسی تعریف کی کہ اس سے پہلے کسی نے نہ کی ہوگی، انھوں نے لکھا کہ المامون کی زبان ایسی ہے کہ دلی والوں کو بھی رشک آتا ہوگا۔ اس کے بعد شبلی نے سیرۃ النعمان لکھی اس کا پہلا ایڈیشن بھی کالج کی طرف سے شائع ہوا، المامون میں شبلی نے مامون کی حکومت اور اس کے عہد کی تمام نیرنگیاں دکھلائی تھیں، تو اب انھوں نے سیرۃ النعمان میں امام اعظم کے حالات وسوانح کے ساتھ فقہ اور اس کی جزئیات پر ایسی بحثیں کیں اور ایسا تجزیہ پیش کیا کہ اس سے پہلے اردو میں اس کی کوئی مثال نہ تھی، ان کی یہ تحقیقات جہاں صحبت سرسید کے زیر اثر پیدا ہونے والے جدید ذہن کا پتہ دیتی ہیں وہیں شبلی کے گہرے مطالعہ اور روایتی مذہبی تحقیقات کے گہرے مطالعہ ومشاہدہ سے بھی واقف کراتی ہیں۔

اس کے بعد ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے نصابی رسالہ بدءالاسلام تیار کیا جو عرصہ تک کالج کے نصاب میں شامل رہا۔

شبلی نے کالج میں میلاد کی مجلسیں منعقد کرنے کی طرح کی ڈالی، چنانچہ سیرت نبوی کے جلسے جس میں وہ خود سیرت پر تقریریں کرتے، ہر سال ہونے لگے، پھر اس قدر اہتمام ہوا کہ یہ جلسے سالار منزل اور اسٹریچی ہال میں منعقد ہونے لگے، آپ اندازہ کیجئے، انگریز پرنسپل اور انگریز اساتذہ کے درمیان شبلی کی یہ کوششیں کس درجہ اہم ہے۔ دراصل یہ ان کی مذہبی روح اور مذہب سے حد درجہ لگاؤ کا نتیجہ تھا۔ واقعہ یہ کہ انھوں نے اپنے عالمانہ وقار کا ہمیشہ خیال رکھا۔

سرسید نے کالج کے تعاون کے لیے ایک تھیٹر قائم کیا جس میں سرسید تحریک کے بعض اہم رہنما شریک ہوئے اور اپنے اپنے کردار ادا کئے، اس کا ایک کیریکٹر شبلی بھی تھے اور اس میں ایسا ترکیب بند پیش کیا کہ اسے آج بھی پڑھنے کے بعد حرارت پیدا ہوجاتی ہے۔

سیرت النعمان کے بعد انھوں نے الفاروق کی تصنیف کا آغاز کیا، اور علی گڑھ میں کیا، سرسید شیعہ سنی تفرقہ کے خوف سے الفاروق کی تصنیف کے حق میں نہ تھے، باوجود اس کے شبلی نے اسے لکھا یہ دراصل شبلی کا ذوقی معاملہ تھا، یہ کتاب سرسید کی وفات کے بعد ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی مگر سبقت کی غرض سے جب مولوی سراج الدین نے سیرۃ الفاروق لکھی تو سرسید نے ان سے ناراضی ظاہر کی اور لکھا کہ اگرچہ ہم اس کے حق میں نہیں ہیں مگر مولوی سراج الدین کا سبقت کرنا ٹھیک نہیں ہے، ہمیں انتظار کرنا چاہیے کہ مولوی شبلی کیا لکھتے ہیں اور اسی میں انھوں نے شبلی کی بھی تسلی کی اس سبقت سے کیا اگر دس لوگ بھی لکھیں تو شبلی کی تحریر ان سب میں نرالی ہوگی۔

۱۸۹۴ء میں شبلی نے روم ومصر وشام کا سفر اختیار کیا، نہ صرف علی گڑھ کالج کی تاریخ میں بلکہ ہندوستان کے تمام کالجوں میں شبلی پہلے ایسے پروفیسر تھے جنہوں نے بیرون ھند کا تعلیمی سفر

کیا،اس سفر کے کئی مقاصد تھے،اسلامی تاریخ کی باقیات کامطالعہ ومشاہدہ،اسلامی ممالک کے طریقہ تعلیم اورنصاب تعلیم کامطالعہ،الفاروق جس کی تصنیف کے لیے ھندوستان کے کتب خانے ناکافی تھے،مواد حاصل کرناوغیرہ۔چنانچہ شبلی نے اس سفر میں ان تمام امور اورمقاصد پر گہری نظر رکھی،قسطنطنیہ،بیروت،فلسطین اورخاص طور پر مصر کے مدارس اور کالجوں کامعائنہ کیا،جامع ازہر دیکھا۔قدیم وجدید تعلیم کے تقریباًتمام اداروں کیمعائنہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ وہاں بھی طریقہ تعلیم اور صحیح نہج پر تعلیم کاسلسلہ قائم نہیں ہے۔ انھوں نے جامع ازہر پر بھی اظہار افسوس کیااور سرسید کو لکھا کہ یہاں بھی جدید وقدیم تعلیم علاحدہ علاحدہ ہے اور جب تک اس کے ڈانڈے نہ ملیں گے اصل ترقی مفقود رہے گی۔

اس سفر میں انھوں نے خاص طور پر کتب خانوں کی سیر کی، کتابوں کا مطالعہ کیا،نوٹ لیےاورنقل نویسوں سے کتابیں نقل کرائیں،قسطنطنیہ میں کتب خانوں کی سیر پیدل چل کر کی۔یہ تمام تفصیلات سفر نامہ اور سرسید کے نام خطوط میں موجود ہیں۔

اس سفر میں انھیں نامور شخصیات سے بھی ملنے کاموقع ملا۔شبلی جمال الدین افغانی اور شیخ محمدعبدہ اوران کے افکار سے بھی واقف ہوئے،غازی عثمان پاشاجنھوں نے روسیوں کے چھکّے چُھڑادیئے تھے،ان سے بھی ملاقات ہوئی۔خلیفہ سلطان عبدالحمید کی زیارت کی اور انھوں نے تمغہ مجیدیہ سے سرفراز کیا،غرض وہ لوٹے توان کے ساتھ بہت کچھ تھا، مگر یہ انگریزی حکومت کی پالیسی کے خلاف تھا،انگریز سلطان عبدالحمید کواپنادشمن تصور کرتے تھے۔چنانچہ علامہ شبلی کوپین اسلامزم کاہندوستان میں نمائندہ خیال کیا گیااور سخت ناراضگی ظاہر کی گئی،سرسید نے معاملہ سلجھایااور حکومت وقت سے کہا کہ کالج میں ایک ایسا شخص ہے جسے ترکی حکومت توتمغہ مجیدیہ عطاکرتی ہےاور ہماری حکومت محض ناراضی،چنانچہ سرسید کی کوششوں سے انھیں شمس العلماء کاخطاب ملامگرساتھ ہی تمغہ مجیدیہ کے استعمال پر پابندی عائد کردی گئی، بلکہ ان پرخفیہ پولس بھی لگادی گئی۔

شبلی کوعلی گڈھ کی آب وہواکبھی راس نہیں آئی اوران کی صحت خراب رہی،اس لیے انھوں نے سرسید سے خواہش کی کہ انھیں چھ ماہ کی رُخصت دی جائے،تاکہ وہ چھ ماہ کالج میں رہ کر تعلیم وتدریس کا کام کریں اورچھ ماہ کہیں اور رقیام کرکے تصنیف وتالیف کا کام کریں، گوسید محمود نے اس کی مخالفت کی مگر سرسید نے ان کی یہ تجویز منظور کرلی۔مگر ابھی اس پر عمل بھی نہیں ہوپایاتھا کہ سرسید نے ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کوسفر آخرت اختیار کیا،شبلی کواس کابڑاصدمہ پہونچااور انھوں نے علی گڈھ کی ملازمت سے اسی سال استعفادیدیا۔

شبلی علی گڈھ سے (۱۸۸۳-۱۹۹۸ء) سولہ سال وابستہ رہے،درس وتدریس کافریضہ اس طرح انجام دیا کہ طلبہ میں عربی وفارسی کاصحیح مذاق پیداکردیا،مولانا محمد علی جوہر،شوکت علی ظفر علی خاں،بابائے اردو مولوی عبدالحق،خوشی محمد ناظر،سجادحیدر یلدرم،مولوی مسعودعلی محوی اوربہت سے ایسے نام ہیں جن کامذاق شعروادب اورعلم وادب سے گہراگاؤ،اور تحقیق وتدقیق کاچسکہ انھیں کاپیداکردہ ہے،مولاناجوہرتوآخرتک کہتے رہے کہ میرا ذوق قرآن استاد شبلی کی دین ہے۔یہاں یہ ذکرضروری ہے کہ علی گڈھ کالج میں تعلیم کے آغاز سے پہلے وہ درس قرآن دیتے جس میں تمام طلبہ شریک ہوتے اور یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔پہلے سیرت کے جلسے اور پھر درس قرآن کے ذریعہ شبلی نے علی گڈھ میں مذہبی فضا قائم کی،اس دور کے متعدد طلبہ نے اس سے اپنے شغف کاذکر کیاہے۔

شبلی علی گڈھ میں سرسید کے ساتھ رہے،ان کی صحبتوں میں شریک غالب رہے،ان سے بہت کچھ سیکھامگر ان کے بعض نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کرتے تھے،خاص طور پر بعض مذہبی اورسیاسی معاملات میں ان کانقطہ نظر مختلف تھا،اس سے سرسید بھی واقف تھے۔مگر انھوں نے کبھی اس پر ناراضی کااظہار نہیں کیااور وہ جس بلندظرف کے شخص تھے وہ کر بھی نہیں سکتے تھے مگر بعد میں علی گڈھ کے بعض نام نہاد اور شبلی کے سوانح نگار نے غیرضروری طور پر اس اختلاف رائے کو ہوادی اور نقطہ نظر کے اختلاف کوذاتی اختلاف ثابت کرکے دوریاں پیدا کرنے کی کوشش کی،غوروفکر کرنے والے ذہنوں میں اختلاف ہوتاہے،اور ہوناچاہیے، زمانہ کی رفتار اور نئی ضرورتوں کے تقاضوں سے کون انکار کرسکتاہے۔سرسید نے ۱۸۵۷ء کے سانحات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے شبلی اس کے بعد کی نسل سے تھے،انھوں نے اپنے دور کے لحاظ سے سیاسی معاملات میں ایک نیانظریہ اختیار کیا،ڈیڑھ سوبرس بعد آج ہم جائزہ لیں توایسا محسوس ہوتاہے کہ سیاسی معاملہ میں شبلی کانظریہ کسی قدر درست تھا، مگر سرسید کاقوم سے مخلصانہ معاملہ بھی کم اہمیت کاحامل نہیں تھا۔

شبلی علی گڈھ سے ملازمت سے علاحدہ ہوئے،علی گڈھ سے کبھی علاحدہ نہ ہوئے،ان کے خطوط سے معلوم ہوتاہے کہ وہ ہمیشہ کالج میں قیام کے خواہاں رہے۔ ۱۹۰۴ء میں ان کے دوست محسن الملک نے انھیں کالج سے دوبارہ وابستہ ہونے کے لیے راضی بھی کرلیاتھا۔

وہ سرسید کے زمانہ میں اور بعد میں بھی ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوتے رہے،اس میں تقریریں کرتے اور قرار دادیں پیش کرتے،اختلاف واتفاق کرتے،اور پورے طور پر مباحثہ میں دلجمعی سے شریک رہتے۔یہی وجہ ہے کہ ملازمت سے علاحدگی کے پانچ سال بعد انھیں ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے ایک شعبہ انجمن ترقی اردو کاسکریٹری نامزد کیا،جس پر وہ دوبرس تک فائز رہے۔چنانچہ ترقی اردو کے منصوبے بنائے،اہل علم اور ادباء وشعراء سے خط وکتابت کی،اس کے حساب کتاب کانظم کیا،ترجمہ کے لیے متعدد کتابوں کا انتخاب کیا،ادباء کوانعامات دینے کاسلسلہ قائم کیااور انجمن کی ماہ بہ ماہ رپورٹ لکھ کرنواب محسن الملک کوپیش کرتے رہے باباۓ اردو مولوی عبدالحق نے شبلی ہی کی بچھائی ہوئی بساط پرانجمن میں نئے برگ وبار پیدا کئے اور سچ یہ ہے کہ انھوں نے شدید اختلاف کے باوجود اپنے استاذ ہی کی خواہشوں کی تکمیل کی۔

ان کے آخری دور میں آغاخان کی سرکردگی میں یونیورسٹی فاؤنڈیشن کاقیام عمل میں آیااس کے ایک رکن شبلی بھی تھے۔لکھنؤ میں اس کے جلسوں میں شریک رہے،مالی تعاون میں بھی حصّہ لیااور یونیورسٹی کے لیے جووفد گورنر سے ملنے شملہ گیاتھااس میں شبلی بھی شامل تھے، گویا علی گڑھ کالج کویونیورسٹی بنانے میں شبلی کابھی حصہ ہے۔

علامہ شبلی اخیر تک کالج آتے اورطلبہ سے خطاب کرتے رہے،اسی کالج میں انھوں نے کہا

تھا کہ یہ کالج جس طرح طلبہ کی تربیت کرتا ہے،اسی طرح اساتذہ کی بھی تربیت کرتا ہے، طلبہ کو اگر بی اے-ایم اے کرتا ہے تو اساتذہ کو شمس العلماء بناتا ہے، یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ شبلی کو سرسید نے شمس العلما کا خطاب جس وقت دلوایا اس وقت تک ڈپٹی نذیر احمد اور حالی کو بھی شمس العلماء کا خطاب نہیں ملا تھا۔ بہرحال شبلی نے اخیر تک کالج سے تعلق رکھا۔ آخری بار انھوں نے اسٹریچی ہال میں ۱۹۱۳ء میں اپنے انتقال سے چند ماہ پہلے خطاب کیا،جس کی روداد انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے اور وہ خطبات شبلی میں شامل ہے۔شبلی علی گڈھ میں نہ صرف سرسید کی صحبتوں میں شامل رہے بلکہ ان کے ساتھ سفر بھی کیا سرسید کے نینی تال سفر میں بھی ساتھ رہے،اسی طرح وہ حیدرآباد کے سفر میں بھی ان کے ساتھ گئے،وہاں کے جلسوں میں تقریریں کیں، ترکیب بند پیش کئے،ان کی انہی علمی و تصنیفی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر نظام حیدرآباد کی طرف سے انھیں وظیفہ ملا اور ان کی آئندہ تصنیفات کو سلسلہ آصفیہ میں داخل کرنے کا حکم ہوا اور بعد کی چند تصنیفات اسی کے تحت شائع ہوئیں۔

استعفیٰ کے بعد شبلی علی گڈھ سے اعظم گڈھ آئے،الفاروق پایہ تکمیل تک پہونچی اور ۱۸۹۹ء میں مطبع نامی کان پور سے شائع ہوئی،اسی زمانہ میں ان کے والد شیخ حبیب اللہ بیمار ہوئے اور ۱۲/اگست ۱۹۰۰ء کو وفات پائی، شیخ صاحب کی آمدنی تو بہت تھی،وکالت کے علاوہ نیل اور شکر کے گودام اور زمینداری سے بہت کچھ آتا تھا مگر وہ بڑے دریا دل اور شاہ خرچ تھے، رفاہ عام کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے،دوسرے بیٹے مہدی حسن کی لندن میں بیرسٹری کی تعلیم میں بھی ایک بڑی رقم خرچ ہوئی اور پھر ان کی واپسی پر شیخ صاحب نے اعظم گڈھ میں ایسی دعوت کی جو ہفتہ بھر چلتی رہی،اس لیے جب انھوں وفات پائی تو ایک بڑا قرض چھوڑا جس کے ادا کرنے کی ذمہ داری علامہ شبلی کے ذمہ آئی،چنانچہ انھوں نے ندوہ کے بجائے حیدرآباد کا رُخ کیا اور ۱۹۰۱ء میں ناظم سررشتہ علوم وفنون حیدرآباد کے عہدہ پر فائز ہوئے۔حیدرآباد میں وہ چار سال اور کچھ ماہ رہے،اس دوران ملازمت کے فرائض کے علاوہ انجمن ترقی اردو کا بار گراں اُٹھائے رہے،اس کے علاوہ انھوں نے چار اہم کتابیں سپرد قلم کیں۔الکلام، علم الکلام، سوانح مولانا روم اور الغزالی اسی قیام حیدرآباد کی یادگاریں ہیں،اپنے موضوع پر یہ اس قدر اہم کتابیں ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے نے کتنی محنت اور مشقت کا سامنا کیا ہوگا،خاص طور پر سوانح مولانا روم میں تحقیق منسوبات میں انھوں نے جو زور تحقیق صرف کیا ہے وہ انہیں کا حصّہ ہے۔حیدرآباد کے اندرونی سیاسی حالات سے وہ دل برداشتہ تھے اور اب والد کا قرض بھی ادا ہو چکا تھا،چنانچہ انھوں نے استعفیٰ دیا اور وظیفہ جاری کرنے کی درخواست دی،دونوں منظور ہوئے اور اب انھوں نے بقیہ زندگی ندوہ کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کیا اور لکھنوآ گئے اور بقیہ زندگی وہیں گذار دی۔

تحریک ندوہ کے وہ ابتدائی فعال لوگوں میں تھے،وہ اس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے،قرار دادیں پیش کرتے، تعلیم، طرز تعلیم اور نصاب تعلیم پر بحث کرتے، سچ تو یہ کہ ہمارے قدیم علوم پر ان کی جتنی گہری نظر تھی، شاید ہی تحریک ندوہ میں کسی اور کی رہی ہو،یہی وجہ ہے کہ ندوہ کا دستور انھوں نے بنایا اور اس کے اغراض ومقاصد طے کئے۔ دارالعلوم کا نصاب تعلیم بھی انھیں نے بنایا،اسی سے متاثر ہوکر انھیں ۱۹۰۴ء میں معتمد تعلیم مقرر کیا گیا،چنانچہ وہ ندوہ آئے تو اپنی تمام صلاحیتیں اس پر لگادیں، تھے تو وہ معتمد تعلیم مگر ندوہ کے لیے خط وکتابت کرنا، تعاون کے لیے سفر کرنا،اہل ثروت اور والیان ریاست سے رابطہ کرنا، سب انھوں نے اپنے سر لے لیا اور بڑی بڑی رقمیں حاصل کیں،ان سے پہلے ندوہ کا خزانہ خالی تھا انھوں نے اپنی جدوجہد سے اس کی مالیات کا مسئلہ حل کر دیا۔

وہ دارالعلوم میں جاتے تو مختلف درجات میں چلے جاتے خود پڑھاتے اور اساتذہ کو بھی طریقہ تدریس کے ہنر سمجھاتے، پُرانے طرز تعلیم کے بجائے وہ جدید تعلیم یعنی لکچر کا طریقہ اختیار کرنے پر زور دیتے،ندوہ میں انھوں نیقرآن بھی پڑھایا اور بخاری بھی،یہی نہیں انھوں نے ملک کے ممتاز علماء کو بلاکر ندوہ میں تعلیم کا معیار بلند کیا،مولانا حمید الدین فراہی کو اکثر بلاتے جو قرآن پر درس دیتے اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب سالانہ جلسہ ندوہ میں مصر سے شیخ رشید رضا ایڈیٹر المنار کو بلاکر صدارت کرائی،اسی اجلاس میں مولانا سید سلیمان ندوی نے عربی میں ایسی برجستہ تقریر کی تھی کہ خوش ہوکر بھرے جلسے میں اپنا عمامہ ان کے سر پر رکھ دیا تھا۔یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے ندوہ کا رشتہ عالم عربی سے قائم کیا۔اور ندوہ کی آواز عالم عرب میں گونجی۔ ندوہ کے نصاب تعلیم میں انگریزی کی شمولیت پر بڑے لیت ولعل سے کام لیا گیا جس پر انھیں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا مگر بالآخر انہیں کامیابی ملی،بعد میں تو انھوں نے ہندی اور سنسکرت تک کا شعبہ قائم کیا۔

۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۳ء تک وہ ندوہ سے وابستہ رہے،مولویوں کے ایک گروہ نے اندرون ندوہ انھیں مسلسل اُلجھا کر رکھا، کبھی ندوہ کے معاملات میں تنگ کرتے، کبھی ان کی کسی کتاب کی عبارت نقل کرکے کفر کے فتوے لگاتے،انھیں دارالعلوم میں علی گڈھ کے تعلق کی بنیاد پر ساقط الاعتبار قرار دیتے،ان کے ہر کام میں رکاوٹ ڈالتے، مگر خدا جانے وہ شخص کس چیز کا بنا تھا کہ باوجود ان تمام الجھنوں کے اپنے کاموں میں مسلسل لگا رہا۔تحریک وقف علی الاولاد اسی زمانہ میں شروع کی،ندوہ کے اجلاس میں اس کو منظور کرایا،ملک کے تمام بیرسٹر اور قانون دانوں سے رابطہ کیا،ان میں ایک نام علامہ اقبال کا بھی ہے۔ بالآخر وہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی اس سلسلہ میں علماء سے فتاوے حاصل کئے،دستخطی مہم چلائی،نتیجہ یہ ہوا کہ محمد علی جناح نے اسے پارلیامنٹ میں بل کی شکل میں پیش کیا،اور حکومت قانون بنانا منظور کیا۔

تعطیل نماز جمعہ بھی ان کا اسی دور کا کارنامہ ہے،اسی زمانہ میں شدھی تحریک نے زور پکڑا اور ارتداد کی لہر اُٹھی تو ان کی جان پہ بن آئی،خود انھوں نے شاہجہاں پور وغیرہ کا دورہ کیا، راجپوتانہ میں معتمد اشخاص بھیجے اور اس کے سدباب کے لیے اصول وضوابط بنائے اور ایک زمانہ تک فکر مند رہے۔ان تمام سرگرمیوں کے ساتھ ماہنامہ الندوہ کی ادارت کرتے رہے،اور اس کو اپنی کوششوں اور تحریروں سے ایسا رسالہ بنا دیا،جس نے اندھیرے میں روشنی کا کام لیا اور بے شمار لوگ اس سے مستفید ہوئے۔ الندوہ سے انھوں نے ایک اور

بہت بڑا کام لیا، تصنیف وتالیف کے لیے انھوں نے اسی رسالہ کے ذریعہ طلبائے ندوہ کی تربیت کی، مولانا سید سلیمان ندوی مولانا عبدالسلام ندوی، عبداللہ عمادی وغیرہ نے یہیں قلم پکڑنا سیکھا اور آسمان علم وادب پر اہل قلم کی حیثیت سے چمکے، مولانا ابوالکلام آزاد بھی چند ماہ الندوہ کے نائب ایڈیٹر رہے، اور شبلی کی صحبت اور ان کے چشمہ شیر میں سے اپنی تشنگی بجھائی۔ ندوہ کی ان مصروفیات کے ساتھ ان کا سلسلہ تصنیف تالیف بھی مسلسل جاری رہا، پہلے موازنہ انیس ودبیر پھر شعرالعجم کی چار جلدیں یہیں لکھیں، موازنہ اور شعرالعجم کی اہمیت سے اہل علم وادب واقف ہیں۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ ندوہ کی مذکورہ بالا مصروفیات میں ایسی عظیم الشان کتابیں سپرد قلم کی جاسکتی ہیں۔ الندوہ کے سیکڑوں مضامین، جلسہ ندوہ کی سالانہ رودادیں اور سیکڑوں خطوط لکھنے کے ساتھ ساتھ ایسی معرکۃالآراء کتابوں کی تصنیف ایک عبقری ہی کے بس کی باتیں تھیں۔

شعرالعجم ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان کا پرواز تخیل دربار رسالت میں پہونچ گیا اور انھوں نے اسے ہر کام پر فوقیت دی اور اس کے لیے بڑی جدوجہد کی، جس کی تفصیل حیات شبلی میں دیکھی جاسکتی ہے، بالآخر انھوں نے اس عزم کے ساتھ ”اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہوسکتی“۔ کام کا آغاز کیا اور واقعی ایسی ہی عظیم الشان سیرۃ النبیؐ ان کے قلم سے نکلی اور اسی لازوال کتاب پر ان کے قلم کی سیاہی خشک ہوئی، ان کی صحت پہلے سے خراب تھی، اسی زمانہ میں ان کے بھائی محمد ایڈوکیٹ نے یکایک جوانی میں انتقال کیا جس سے وہ بہت دل برداشتہ ہوئے اور خون کے آنسو روئے، کلیات شبلی میں یہ مرثیہ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۱۳ء میں وہ ندوہ کی روز، روز کی الجھنوں سے تنگ آکر مستعفی ہوئے اور اعظم گڈھ آکر دارالمصنفین کے قیام کا سامان کرنے لگے، شہر کے قلب میں واقع اپنا باغ اور بنگلہ وقف کیا، مہمان خانہ کی تعمیر کرائی، طلبہ کو بلایا، اس کے مالی انتظامات کی فکر میں تھے کہ ان کا وقت آخر آپہونچا اور سیرت سیرت کہتے ہوئے اپنے رب کے حضور پہونچ گئے۔ ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کا انتقال ہوا، پورے ملک میں صف ماتم بچھ گئی، بیگم سلطان جہاں فرماں روائے بھوپال نے کہا کہ... ”فقیر بے نوا چل بسا اور اب سلطان کی باری ہے“۔

دارالمصنفین کے احاطہ میں ان کی تدفین عمل میں آئی، ان کے مزار پر انھی کے یہ اشعار کندہ ہیں

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتم بالخیر ہونا تھا

بلاشبہ علامہ شبلی نہ صرف ھندوستان بلکہ عالم اسلام کے مایہ ناز عالم اور مصنف ومفکر تھے، ان کی دینی خدمات جہاں اسلامی تاریخ کے روشن باب کا حصّہ ہیں، وہیں ان کی ادبی خدمات ادبیات عالم کا جزو جمیل، اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔

دی گرینڈ ڈاٹر پراجیکٹ

زیر تبصرہ کتاب انڈین برٹش انٹر پریونر شاہین چشتی کی تحریر کردہ ہے۔ گوکہ یہ ان کی پہلی تخلیق ہے مگر قاری کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ مصنف کی تحریر کردہ پہلی کتاب ہے۔ شاہین چشتی نے انتہائی جذباتی کہانی لکھی ہے جس میں انھوں نے ۳ بالکل مختلف خواتین کے تجربات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اپنی پوتیوں کیلئے سماجی رویئے کو بہتر بنانے کیلئے اجتماعی طور پر اپنی آوازیں بلند کیں، ان خواتین کے گرد موجود جن لوگوں نے ان کی زندگیوں میں اہم کردار ادا کیا انھیں انتہائی مایوس کن صورت حال سے دوچار کر دیا تھا، نوجوان اور تنہا ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے مسائل پر قابو پانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ایک بہترین افسانوی ناول وجود میں آ گیا۔ گرانڈ ڈاٹر پراجیکٹ میں جیسے جیسے ان خواتین کی سابقہ زندگیوں کے بارے میں انکشافات سامنے آتے جاتے ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے تعلق ظاہر ہوتا جاتا ہے قاری اس ناول میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور یہ ناول قاری کو پوری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیتا ہے۔ اس ناول میں مختلف موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے جس میں صنفی عدم مساوات، نسلی زیادتیاں، جنگ کے زمانے کا خوف اور خواتین کی آزادی شامل ہے گرانڈ ڈاٹر پراجیکٹ میں تاریخ کے چند بڑے المیوں اور سانحات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جس میں ۱۹۵۸ میں نوٹنگ ہل کے نسلی فسادات جسنے پورے برطانیہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور یہ اگست ۱۹۵۸ سے ستمبر ۱۹۵۸ تک جاری رہے۔ اس میں ۱۹۴۳ میں بنگال میں پڑنے والے قحط کا بھی ذکر ہے جس کے نتیجے میں ایک اندازے کے مطابق ۳ ملین افراد فاقہ کشی، ملیریا اور دیگر ہلاکت خیز امراض کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے تھے۔ اس میں ہولو کاسٹ بھی شامل ہے جس میں دوسری جنگ عظیم کے دوران ٦ ملین یورپی یہودیوں کو منظم انداز میں قتل کیا گیا۔ شاہین چشتی ایک بھارت نژاد برطانوی مصنف، عالمی امن کے وکیل اور دانشور بھی ہیں۔ شاہین لندن کی ادبی سوسائٹی اور لندن کے مسلم جیوش فورم کے رکن بھی ہیں۔ وہ خواجہ معین الدین چشتی کے پیروکار ہیں، جن کا مزار اجمیر شریف میں جو درگاہ اجمیر شریف کے نام سے مشہور ہے۔ شاہین نے ۱۵ سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ لندن منتقلی سے قبل اجمیر شریف کے مایو اسکول میں تعلیم حاصل کی، لندن میں انھوں نے ہالینڈ پارک اسکول سے اپنی سیکنڈری کی تعلیم مکمل کی، جس کے بعد انھوں نے لندن کی گلڈ ہال یونیورسٹی سے اکاؤنٹنسی کی ڈگری حاصل کی اور اس طرح ایک کوالیفائیڈ پروفیشنل اکاؤنٹنٹ بن گئے۔ شاہین نے افسانہ اور نان فکشن دونوں میں طبع آزمائی کی ہے، ان کی تحریروں کا محور خواتین کی حالت میں بہتری اور خاص طور پر مسلمان خواتین کی آزادی ہے۔ ان کا یقین ہے کہ خواتین کو با اختیار بنانا اسلامی تعلیمات کی بنیاد ہے۔ گرانڈ ڈاٹر پراجیکٹ شاہین کا شاہکار ناول ہے۔ وہ صوفی ازم کے فلسفے محبت سب کیلئے، نفرت کسی سے نہیں پر پختہ یقین رکھتے ہیں، شاہین کی کوشش امن، یکجہتی اور اتحاد کا پیغام عام کرنا ہے یہی صوفی ازم کا چشتی طریقہ کار ہے۔

وسط ایشیاء کے سفر نامہ سے ایک ورق

تحریر: آصف جیلانی

موت کا نشان جو موت کے حکم سے بچ گیا

بخارا کے چھوٹے سے ہوائی اڈے سے جب میں شہر کی سمت جا رہا تھا تو پتلی سی سڑک کے دونوں طرف ریت کے بے ہنگم ٹیلے دکھائی دیئے اور ان کے پیچھے دور تک وہ کھیت تھے جو کپاس کی پے در پے فصلیں اگا کر بدحال نظر آتے تھے۔ پھر ان سے پرے دور تک روسی انداز کے فلیٹوں کی عمارتیں کھڑی پرولتاری دور کی ناکامی کی یاد دلا رہی تھیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا یہ زرافشاں دریا کی وہی سرزمین ہے جس نے دنیا کی تہذیب و تمدن کی تاریخ کو شان و شوکت اور فخر و افتخار سے مالا مال کیا تھا۔ اور کیا یہ پتلی سے سڑک، چین کو یورپ سے ملانے والی وہی، شاہراہ ریشم ہے جس پر واقع بخارا صدیوں تک علم و حکمت، فن و حرفت اور آرٹ اور ثقافت کا ایک درخشاں مرکز رہا ہے،

لیکن جیسے ہی زرافشاں دریا پار کر کے جب میں شہر کے مضافات میں پہنچا تو سامنے صدیوں پرانے، دو بڑے بڑے میناروں کے بیچ میں ایک دروازہ نظر آیا۔ یہ بخارا کے چار دروازوں میں سے بچا ہوا ایک دروازہ ہے جو تاریخ کے آشوب اور موسم کے ستم جھیل کر بھی ڈٹا کھڑا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی اینٹوں پر مجھے رشک آیا کہ انہوں نے کیسے کیسے دور دیکھے ہوں گے۔ کیسے کیسے لوگوں کو دیکھا ہوگا، ان کی باتیں سنی ہوں گی۔ ان میں سے بہت سوں کی آرزوئیں پوری ہوتی دیکھی ہوں گی اور بہت سوں کی تمناؤں کی ناکامی کے درد کو محسوس کیا ہوگا۔ اس دروازہ کے مسمار شدہ دروازہ کا ایک حصہ ان سب باتوں کی شہادت دیتا نظر آتا تھا۔ بخارا محض چند صدیوں پرانا شہر نہیں۔ یہ تین سو تیس سال قبل مسیح میں بھی تجارت اور ثقافت کا اہم مرکز تھا جب یہاں سے سکندر اعظم گزرا تھا۔ کہتے ہیں اس شہر کا موجودہ نام بودھوں کے زمانے میں پڑا تھا۔ یہاں بدھ مت کی ایک بڑی عبادت گاہ تھی جو "ویہارہ" کہلاتی تھی اور یہ نام بدلتے بدلتے پہلے "بےخارہ" اور پھر بخارا بن گیا۔

آٹھویں صدی تک یہ شہر زرتشتیوں کا اہم مرکز تھا۔ لیکن جب ۷۱۱ء میں عین اس وقت جب محمد بن قاسم بحیرہ عرب پار کر کے سندھ میں داخل ہوئے، ایک اور عرب جرنیل، قتیبہ ابن مسلم، آمو دریا پار کر کے وسط ایشیاء میں داخل ہوئے تھے اور دو برس کے اندر اندر یہ بخارا اور سمرقند فتح کرتے ہوئے مشرق میں سنکیانگ میں کاشغر تک پہنچ گئے۔ یہ فوجی فتح تھی۔ لیکن درحقیقت اسلام کی روشنی اس سے کئی برس پہلے رسول اللہ ﷺ کے ایک عم زادے حضرت قاسم بن عباس نے پھیلائی تھی۔

بخارا کی قدیم تاریخ کے اوراق ذہن میں الٹتا ہوا جب میں پرانے شہر کے مغربی سرے پر پہنچا تو دیکھا کہ سامنے گہرے آسمان کے پس منظر میں خاکی اینٹوں کا بنا ہوا ایک خوبصورت چوکور مقبرہ کھڑا ہے اپنی ایک نرالی آن بان کے ساتھ۔ مقبرہ سادہ اینٹوں سے اس ترتیب اور کاریگری سے سجا ہوا تھا کہ دیواریں اینٹوں سے بنی ہوئی نظر آتی تھیں۔ قندیلیں بھی دیواروں میں اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں اور اوپر گنبد بھی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ کرشمہ ان اینٹوں کا یہ تھا کہ سورج کی روشنی کے ساتھ ساتھ ان کا رنگ بھی بدلتا نظر آتا تھا۔ معجزہ یہ کہ یہ مقبرہ چنگیز خان کے حملے کی تباہی سے بچ گیا کیونکہ جس زمانے میں بخارا پر چنگیزی تباہی ٹوٹی اس وقت یہ مقبرہ ریت میں دبا ہوا تھا۔ یہ سامانی سلطنت کے چشم و چراغ، اسمٰعیل سامانی کا مقبرہ ہے۔ نویں صدی میں بخارا، سامانی سلطنت کا دارالحکومت تھا جس کی سرحدیں افغانستان میں ہرات تک اور ایران میں اصفہان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں بخارا کی آبادی تین لاکھ تھی اور اس شہر میں ڈھائی سو دینی مدرسے تھے جہاں یمن اور اندلس ایسے دور دراز مقامات سے طالب علم دینی علم کی پیاس بجھانے آتے تھے۔ اُس زمانے میں یہ محض دینی مرکز ہی نہیں تھا بلکہ سائنس اور دوسرے علوم کا بھی سرچشمہ تھا۔ کہتے ہیں کہ سامانی حکمران کے کتب خانے میں ۴۵ ہزار کتابیں تھیں اور اس زمانے میں بخارا، بغداد کا ہم پلہ مانا جاتا تھا۔ اسی کتب خانے سے حسین ابن عبداللہ ابن سینا نے فیض حاصل کیا تھا اور دنیا میں ابن سینا کے نام سے ایک فلسفی، طبیب، ماہر نجوم، ریاضی دان، موسیقار اور شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر میں انہوں نے سامانی حکمران کے ایک پرانے مرض کا ایسا کامیاب علاج کیا کہ جس سے خوش ہو کر بادشاہ نے انہیں اپنے کتب خانے سے فیض حاصل کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ پھر اسی کتب خانہ میں ان کی اپنی تحریر کردہ کتابوں کا اضافہ ہوا۔ ابن سینا ہی نے سب سے پہلے ارسطو کا ترجمہ عربی میں کیا اور انہوں نے ادویات کی مشہور کتاب "قانون" مرتب کی جو علم طب کی انسائیکلوپیڈیا مانی جاتی ہے۔ کئی سال تک ابن سینا سامانی دربار میں وزیر اعظم بھی رہے۔

بادشاہ کے محل کے قریب ہی بخارا کا کلاں مینار ہے۔ بارہویں صدی کا یہ مینار جو ڈیڑھ سو فٹ بلند ہے، وسط ایشیاء کا سب سے بلند مینار مانا جاتا ہے۔ اینٹوں سے بنے اس مینار کا اوپری حصہ بالکل روشنی کے مینار، لائٹ ہاوس کی مانند ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مینار اُس زمانہ میں قافلوں کی راہ نمائی اور ان کی نگرانی کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن میری راہنما نتاشا کا کہنا تھا کہ اور بھی مصرف تھے اس مینار کے۔ ایک زمانے میں اس کلاں مینار کو ٹیکس ادا نہ کرنے والے افراد یا بادشاہ کے مخالفین کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ جسے سزائے موت سنائی جاتی تھی اسے پہلے سیڑھیوں سے اوپر لے جایا جاتا تھا پھر اسے نیچے شہر کا آخری نظارہ کرایا جاتا تھا اور پھر اسے بوری میں بند کر کے نیچے گرا دیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سزائے موت کا یہ طریقہ بیسویں صدی کے اوائل تک جاری تھا اور زار روس کے دور میں بھی اس مینار کا یہ مصرف تھا۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ بارہویں صدی میں جب چنگیز خان نے بخارا پر حملہ کیا اور تین روز تک محاصرے کے بعد شہر میں داخل ہوا تو وہ اس مینار کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ چنگیز خان نے موت کے اس مینار کے علاوہ بخارا کی

تمام عمارتوں کو زمیں بوس کر دینے کا حکم دیا موت کے حکم سے موت کا یہ نشان بچ گیا۔ جو اب تاریخ کا ایک نشان رہ گیا ہے۔ بخارا نے چنگیز خان کی تباہی و بربادی ہی کا سامنا نہیں کیا بلکہ اس نے خود اپنے حکمرانوں کا ظلم وستم بھی دیکھا ہے۔ ایسے ہی حکمرانوں میں بخارا کا ایک حکمران نصر اللہ تھا جس کا طویل دور ۱۸۲۶ء میں شروع ہوا تھا، اقتدار اس نے اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی کو قتل کر کے حاصل کیا تھا اس کے بعد اس نے اپنے تین چھوٹے بھائیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تا کہ اس کے اقتدار کو کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ امیر بخارا کا محل، قلعہ نما ہے اس میں دربار میں داخل ہونے کا دروازہ اتنا چھوٹا تعمیر کیا گیا ہے کہ جو بھی دربار میں داخل ہوتا اسے جھک کر جانا پڑتا۔ کیسا نرالا طریقہ اختیار کیا تھا اس زمانے میں امیر بخارا نے لوگوں کو اپنے سامنے جھکانے کا۔ کلاں مینار کے نزدیک ہی بخارا کا وہ تاریخی مدرسہ ہے جو "میر عرب" مدرسہ کہلاتا ہے۔ یہ تین سو سال پرانا ہے۔ اس کے بارے میں میری راہ نما نتاشا نے بتایا کہ میر عرب واحد مدرسہ تھا جس میں کمیونسٹ دور میں بھی دینی تعلیم کی اجازت تھی۔ اُس زمانہ میں اس مدرسہ میں صرف ۸۰ طالب علموں کو داخلہ ملتا تھا لیکن موجودہ منتظمین نے بتایا کہ اب بارہ سو طالب علموں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ میر عرب مدرسہ کے قریب ہی ایک خوب صورت مسجد ہے جو مسجد بالائے حوض کہلاتی ہے۔ یہ اٹھارویں صدی میں تعمیر ہوئی تھی جو اصفہان کی مشہور مسجد کے طرز کی ہے۔ بخارا کے مضافات میں ممتاز صوفی اور نقشبندی طریقہ کے بانی عالم دین حضرت بہاء الدین نقشبندی کا مزار ہے۔ چھ سو سال پرانا یہ مزار نہایت سادہ لیکن وسیع مسجد کے احاطہ میں ہے اس احاطہ میں دو کنویں ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خود حضرت نقشبندی نے کھودے تھے۔ یہی وجہ ہے ان پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ میں جب ان میں سے ایک کنویں پر پانی کے لئے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا تو دیکھا کہ مسجد کے دالان کے ایک کونے میں میری راہ نما نتاشا سر پر اسکارف ڈالے امام مسجد کے سامنے بڑے خضوع وخشوع سے دوزانو بیٹھی ہے اور امام صاحب اس کے لئے دعا مانگ رہے ہیں۔ روسی نژاد عیسائی نتاشا کی یہ عقیدت دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ جذبہ عقیدت کس تیزی سے مذہب کی حدوں کو پھلانگ گیا تھا۔

❁❁❁

وائرس کے دور میں وائرس سے مدد

شب کوری (Night Blindness) کا کامیاب علاج

تحریر: ڈاکٹر طارق مرزا۔ آسٹریلیا

قارئین کرام ہم جس دور میں سے آج کل گزر رہے ہیں یہ ایک ایسی عالمی وباء (کووڈ 19) کا دور ہے جو ایک وائرس نے پھیلائی ہے۔ بڑی بڑی سپر پاور کو اس وائرس نے جس طرح افرادی اور معاشی طور پر ضرب لگائی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ غریبوں کا حال اس سے بھی برا ہے۔ لوگ جھولی اٹھا اٹھا کر وائرس کی دہائی دے رہے ہیں۔

لیکن یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اور نہ صرف اشرف المخلوقات بنایا ہے بلکہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے اسے انسان کے لیئے مسخر بھی کر دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (سورہ لقمان آیت 20)

ترجمہ: "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اللہ نے تمہارے لئے مسخّر کر رکھا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں"

چنانچہ ایک طرف اگر ایک وائرس انسانی جانوں کے لئے خطرہ بن گیا تو اشرف المخلوقات نے (کاش اشرف المخلوقات کا یہ گروپ سارے کا سارا مسلمانوں پر مشتمل ہوتا!) اس وائرس کے خلاف ایک اور وائرس سے مدد لے کر اس موذی کورونا وائرس کے خلاف ویکسین بھی تیار کر لی۔ میرا اشارہ ایسٹرازینیکا کی کووڈ ویکسین کی طرف ہے جو چمپینزی کی نسل کے بندر سے حاصل کئے گئے ایک وائرس کو اس مخصوص ویکسین کے لئے بطور ویکٹر (سواری) استعمال کر کے تیار کی گئی ہے۔

یہی نہیں بلکہ دیگر دو معروف ویکسینیں جو فائزر اور موڈرنا کی ہیں وہ بھی کورونا وائرس کا جینیاتی جائزہ لینے اور اس کے طریق افزائش کی مصنوعی اور بے ضرر نقل تیار کر کے ہی تیار کی گئی ہیں۔

جراثیم بشمول وائرس و بیکٹیریا سے انسانی خدمت کا کام لینے کا یہ تجربہ کوئی نیا نہیں۔ اول تو سینکڑوں اقسام کے بیکٹیریا اور وائرس قدرتی طور پر انسانی جسم کے اندر انتہائی ضروری خدمات شب و روز سرانجام دے رہے ہوتے ہیں دوم کچھ اقسام کے بیکٹیریا کو سائنسدانوں نے ادویات بلکہ ہارمون تک تیار کرنے کے کام پر کامیابی سے لگایا ہوا ہے مثلاً "ای کولائی" نام کا بیکٹیریا ایک قسم کی "سنتھیٹک" انسولین تیار کر کے دیتا ہے جو دنیا میں موجود ذیابیطس کے ہزاروں لاکھوں مریضوں کی جان بچانے میں کام آتی ہے۔ بظاہر ای کولائی E Coli ایک ایسا بیکٹیریا ہے جو

انسانی فضلے میں پایا جاتا ہے اور اگر صفائی کا خیال نہ رکھا جائے تو یہی بیکٹیریا جان لیوا بھی ثابت ہوسکتا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات کے لئے اس خطرناک بیکٹیریا کو بھی اس طرح سے قابل تسخیر بنادیا کہ وہ الہ دین کے جن کی طرح اس کا یہ حکم مان کر لیبارٹری کے اندر انسولین تیار کرنے میں جت گیا۔

جبکہ آنت کے اندر رہ کر عمومی طور پر یہ بیکٹیریا خوراک ہضم ہونے اور وٹامن کے Vitamin K تیار کرنے میں مدد دیتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا ارشاد خداوندی کہ اس نے ہم پر اپنی ”ظاہری اور باطنی نعمتیں“ پوری کردی ہیں، کی ایک غیر معمولی مثال یہ بیکٹیریا بھی ہے جو جسم انسانی کے باطن میں بھی اور ظاہر میں بھی ایک نعمت غیر مترقبہ کے طور پر سامنے آیا ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (سورہ رحمٰن)

امابعد، قدرے طویل مگر ناگزیر تمہید پہ معذرت کے ساتھ آمدم برسر مطلب، آسٹریلیا سے اچھی خبر یہ ہے کہ دو نوجوان بہن بھائی وائرس کی مدد سے اب رات کو بھی پڑھنے لکھنے بلکہ آسمان پہ روشن ستاروں کو زندگی میں پہلی بار دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ انہیں پیدائشی طور پر ایک جینیاتی سقم کی وجہ سے شب کوری یعنی نائٹ بلائینڈ نیس (Night Blindness) کی معذوری لاحق تھی جو عموماً خاندانی اور موروثی ہوتی ہے۔ اس کا آغاز اوائل عمری میں ہی ہوجاتا ہے۔

واضح رہے کہ شب کوری یعنی کم روشنی، بالخصوص رات کو کچھ بھی سجھائی نہ دینے کے مرض کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں مثلاً موتیا، ذیابیطس جو صحیح طور پر کنٹرول نہ کی جارہی ہو، اسی طرح جن کی دور کی نظر بہت کمزور ہو انہیں بھی کم روشنی میں کم دکھائی دیتا ہے، اسی طرح آنکھ کے اندر اگر پریشر بہت بڑھا ہوا ہو، جسے گلاکوما کہتے ہیں وہ بھی شب کوری کا باعث بن سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پردہ بصارت کی سوزش کا کوئی بھی مرض اور اسی طرح وٹامن اے کی کمی بھی شب کوری کا باعث بن سکتی ہے۔

ان اقسام سے جدا ایک قسم شب کوری کی وہ ہے جو موروثی طور پر ایک جینیاتی سقم کی وجہ سے رونما ہوتی ہے۔ مخصوص جینز کی قلت یا ان میں گڑبڑ کی وجہ سے متاثرہ افراد کی آنکھ کے مخصوص خلیات پردہ بصارت میں ایسے مادے تیار کرنے سے جزوی یا کلی طور پر محروم رہ جاتے ہیں جو روشنی کا ادراک کر کے مخصوص ردعمل دکھاتے ہیں اور روشنی کا سگنل دماغ کو پہنچانے والے اعصاب کو متحرک کرتے ہیں۔

ایسے افراد کو دن کی روشنی میں بھی بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ ان کو عموماً بہت ہی موٹے معکوس شیشے کی عینک لگائی جاتی ہے، ان کے لئے صرف سامنے دیکھنا ہی ممکن ہوتا ہے، سائیڈ پہ جو ہِل جُل ہو رہی ہوتی ہے، انہیں دکھائی نہیں دیتی۔

ان میں عام طور پر جو موروثی سقم پایا جاتا ہے اس کی بنیاد پر اسے لیبر کنجینیٹل ایماروسس (Leber Congenital Amaurosi) کہا جاتا ہے۔ جبکہ اس کی متعلقہ بڑی جین آرپی ای 65 (RPE 65 Gene) کہلاتی ہے۔ ایک تخمینہ کے مطابق دنیا بھر میں اس مرض میں مبتلا افراد کی تعداد دو ملین کے قریب ہے یعنی ہر دو ہزار افراد میں ایک فرد اس مرض میں مبتلا ہے۔ متعلقہ جین کلی طور پر یا جزوی طور پر سقم یافتہ ہوسکتی ہے، چنانچہ کچھ افراد میں کم اور کچھ میں زیادہ شدید علامات ظاہر ہو رہی ہوتی ہیں۔

آرپی ای 65 کے علاوہ 260 اقسام کی ایسی جینز دریافت کی جاچکی ہیں جو پیدائشی یا نوجوانی میں شروع ہونے والے نابیناپن یا شب کوری کا باعث بنتی ہیں۔ جینیٹک انجنیئر سائینسدانوں نے اس مخصوص جین (آرپی ای 65) کا تندرست کوڈ ایک وائرس میں منتقل کردیا، جس کی بدولت وائرس یہ جین بنانے کے قابل ہو گیا۔ پھر اس کو انجکشن کے ذریعہ متاثرہ افراد کی آنکھوں کے پردہ بصارت (Retina) تک پہنچا دیا گیا تو وہاں جس مادے کی کمی تھی وہ اس وائرس نے جینیٹک کوڈ کی بدولت پوری کرنا شروع کردی اور روشنی کے تھکے ماندے نیم مردہ اعصاب میں زندگی کی رمق پیدا ہو گئی۔ نتیجتاً متاثرہ افراد دن کے علاوہ رات کو بھی بخوبی دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ وائرل جین پر مشتمل یہ انجکشن لکس ٹرنا (LUXTURNA) کے نام سے دستیاب ہے۔ دنیا میں کئی مریض اس سے قبل اس طریق علاج سے رات میں (اور دن کو بھی) صاف دیکھنے کے قابل ہو چکے ہیں۔

آسٹریلین حکومت کی طرف سے یہاں کے شہریوں کے لئے یہ انجکشن مفت دستیاب کردیا گیا ہے۔ لیکن علاج سے قبل بہت ساری پیچیدہ قسم کی جینیٹک ٹیسٹنگ کی جاتی ہے، جس کے بعد فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کیا اس مرض میں مبتلا کوئی مریض اس انجیکشن سے مستفید ہوسکے گا یا نہیں۔ آسٹریلیا کے کسی مریض کو اس نئے طریق سے پہلی مرتبہ شفا ملنے کا یہ معجزنما واقعہ اس دوران رونما ہوا جب کہ افق کے اس پار نئے پاکستان کے عوام مہنگائی کی بدولت دن کو تارے دیکھنے کے قابل بنادئے گئے ہیں۔

ڈالر کی روزافزوں قدر نے پاکستانیوں کے چودہ طبق روشن کر ڈالے ہیں اور خودساختہ فرزندِ قائداعظم اپنے محکوم عوام کالانعام کی اس کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے آنکھیں بند کر کے بصد فخر وانبساط ”یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے“ گنگناتے نظر آرہے ہیں۔

واضح رہے کہ پاکستانی لیڈروں کو پیدائشی طور پر دن میں بھی کچھ نظر نہیں آتا۔ ان دنوں پاکستان کے نابینا افراد اس لئے بھی مسلسل احتجاجی مظاہرے کررہے ہیں کہ پاکستان پر قابض ان عقل کے اندھوں کو جو مراعات اور پروٹوکول دستیاب ہیں، وہ انہیں بھی مہیا ہونی چاہیئیں۔

واضح رہے کہ مندرجہ بالا جملے معاذ اللہ کسی قسم کے سیاسی طنز و مزاح کے حامل نہیں، یہ تو ایک حقیقت، ایک المیہ ہے جس کا تعلق ہماری طب وصحت خصوصاً بصارت اور بصیرت سے بہت ہی گہرا اور بہت ہی پرانا ہے۔

❀❀❀

ن-م راشد
اور ان کی شعری تصنیفات

تحریر: ڈاکٹر راشد مستحسن

ن م۔ راشدؔ جدید اردو نظم کے عہد ساز شاعر ہیں، اور جس برق رفتاری کے ساتھ سے گزر رہا ہے اردو ادب کے ناقدین اور بالعموم قارئین کو ن م۔ راشدؔ کی غیر سلیس فارسی کے شعری سخن کو سمجھنے کا موقع مل رہا ہے، اور فیض احمد فیضؔ کے بارے میں ان کا یہ نقطہ نظر کہ ”فیضؔ جیسا علم وادب کے رسیا جس نے اپنی شاعری میں اپنا دس فیصد حصہ استعمال کیا“ اختلافات ہو سکتے ہیں، اردو ادب کی عصری شاعری میں ن م۔ راشدؔ کی قدر و قیمت نمایاں ہوتی جارہی ہے اور راشد جدید شاعری کا سب سے معتبر اور مستند حوالہ بن کر سامنے آرہے ہیں۔ ن م۔ راشدؔ کی شاعری سے میرا باقاعدہ تعلق یا تعارف 9 سال کی عمر میں ہوا کیونکہ ہمارے یہاں علی سردار جعفری، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر وزیر آغا، جون ایلیا، زاہدہ حنا صاحبہ، ڈاکٹر مظہر حیدر، ڈاکٹر قمر عباس ندیم، جمیل الدین عالی صاحب کی بحث وتکرار کے ذریعے ن م۔ راشد کی شاعری کی تلخی اور اس کے ساتھ ان کی شاعری میں انسانی جذبات اور احساسات کی بازگشت میرے کانوں تک پہنچی تھی لہٰذا ان مباحثوں کے ذریعے مجھے شاعری کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ لیکن راشد کے مجموعوں کو اب پڑھنے کا موقع ملا تو ان کی شاعری کے اسرار و رموز کھلتے گئے، ن م۔ راشد یکم اگست 1910ء کو گوجرانوالہ کے ایک قصبے علی پور چٹھا میں پیدا ہوئے جو قیام پاکستان سے پہلے ”اکال گڑھ“ کے نام سے مشہور تھا۔ راشد کے خانوادے مذہبی رجحان سے منسلک تھے۔ راشد کا تاریخی نام ”عمر خضر“ جس سے ان کی تاریخ پیدائش 1910ء نکلتی ہے، اسکول کے زمانے ہی سے راشد نے شعر گوئی شروع کر دی تھی اور بمشکل 7 برس کی عمر میں انھوں نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان اگر میں غلط نہیں ہوں تو (انسپکٹر اور مکھیاں) تھا۔ اوائل زمانہ میں ان کا تخلص ”گلاب“ تھا کچھ آپ کی نذر راشدؔ کا کوئی شعر ہو جائے۔

میرے میاں گلاب، دہن میں گلاب ہو
خوشبو سے تیری بابا ترا فیض یاب ہو

یہ گم نام کاوشیں اس زمانے میں کچھ گم نام ادبی پرچوں میں چھپتی رہیں جن میں بجنور سے چھپنے والے رسالے ”تفریح“ اور پانی پت سے چھپنے والے رسالے ”کائنات“ کے نام اہم ہیں، کچھ چیزیں ”خضر عمر“ کے نام سے چھپتی تھیں کیونکہ ابھی تک انھوں نے اپنے قلمی نام کا تعین نہیں کیا تھا کچھ چیزیں ”خضر عمر“ کے نام سے اور کچھ ”نذر محمد خضر عمر جنجوعہ“ کے نام سے چھپیں اور دو غزلیں ”خاطف علی پوری“ کے نام کے پلیٹ فارم سے بھی منظر عام پر آئیں۔ راشدؔ کی ابتدائی شعری تربیت میں ان کے والد راجہ فضل الٰہی چشتی نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ خود تو شعر کم ہی کہتے ہیں لیکن ان کا شعری ذوق بہت اچھا تھا فارسی شاعری سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ حافظؔ، سعدیؔ، غالبؔ اور اقبالؔ سے راشدؔ نے اپنے والد کے ذریعے تعارف حاصل کیا اس زمانے میں راشدؔ نے اپنے کورس میں شامل کچھ انگریزی شاعروں کی نظموں کا شعری ترجمہ بھی کیا۔

ان میں ملٹن کی سانیٹ Sonnet ”نابینا ہونے پر“ اور ورڈز ورتھ Wordsworth اور ہنری لانگ فیلو Henry Long Fellow کی بعض نظموں کے تراجم شامل ہیں۔ راشدؔ نے 1926ء میں گورنمنٹ کالج لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں داخلہ لیا، انگریزی اردو کے علاوہ دوسرے مضامین میں فارسی اور اردو بھی شامل نصاب تھے۔ راشدؔ اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر کالج کے ایک میگزین ”بیکن“ کے ایڈیٹر ہو گئے۔ انھوں نے متعدد مضامین انگریزی میں بھی لکھے ان دنوں راشدؔ کے ایک دوست لائل پور سے ایک رسالہ ”زمیندارہ گزٹ“ نکالتے تھے راشدؔ کی خواہش پر زمیندارہ گزٹ کے لیے انھوں نے نظمیں بھی لکھیں وہ غالباً ”دیہات سدھار“ تھی۔ 1928ء میں انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرلیا اور پھر بی۔ اے کے مضامین میں ان کے پاس انگریزی اقتصادیات اور فارسی تھے ان کی ادبی سرگرمیاں بڑے زور وشور سے جاری تھیں اور وہ کالج کے مشاعروں میں بھی حصہ لیتے رہے ان کی ایک نظم ”تو مرے دل کو سکوں عطا کر خدا کے لیے“ لکھی جس پر ان کو نقد انعام بھی ملا۔ کلیات راشدؔ میں یہ نظم ہم کو نظر نہیں آتی۔

کالج کے زمانے کے دوستوں میں فیض احمد فیضؔ اور آغا عبد الحمید کے نام خاص الخاص ہیں، ان کے اساتذہ میں جید ادبی لوگ تھے جن میں احمد شاہ پطرس بخاری، لینگ

بازن اور ڈکن کے نام بھی آتے ہیں راشدؔ نے کچھ تنقیدی مضامین بھی لکھے جس میں ’’اخترؔ شیرانی کے ساتھ ایک شام، اردو ادب پر غالبؔ کا اثر، ظفر علی خان کی شاعری اور امتیاز علی تاج کا ڈرامہ ’’انار کلی‘‘ خاص ہیں۔ ان کی رہنمائی ڈاکٹر محمد دین تاثیرؔ نے بھی کی۔ ابتدائی ادوار میں انھوں نے اپنی شاعری کے حوالے سے اصلاح بھی لی اور جن سے لی ان میں روشؔ صدیقی شامل ہیں۔ وہ عشقیہ شاعری کرتے کرتے آزاد نظم کہنے لگے، محمد حسن عسکری کو ایک خط میں راشدؔ نے لکھا ’’اردو میں غالباً آزاد نظم سب سے پہلے میں نے لکھی‘‘۔ راشدؔ آزاد نظم کے بانی نہ تھے، میراجی سے قربت ہونے کے ناتے یہ گماں ہوتا ہے، اور تصدق حسین خالدؔ نے بھی ان کی مدد کی۔ اسی زمانے میں راشدؔ نے کئی اچھی نظمیں لکھیں، انھوں نے اپنی آزاد نظم ’’جرأت پرواز‘‘ غالباً 1932ء میں لکھی جو ماورا میں شامل ہے، جس زمانے میں راشدؔ ملتان میں کلرک تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خاکسار تحریک عروج پر تھی یہ زمانہ راشدؔ کے لیے تکلیف دہ دور تھا نہ ہی اس دور میں کوئی ادبی محفلیں منعقد ہوئیں نہ ہی آزادی تحریر کی اجازت تھی، معاشی اعتبار سے یہ دور راشدؔ کے لیے پریشان کن دور تھا انھوں نے معاشی بحران سے نکلنے کے لیے ایک روسی مصنف الیگزینڈر کیرن کے ناول Yama The Pit کا ترجمہ کیا۔ حیات اللہ انصاری کی کتاب ’’ن م۔ راشد‘‘ منظر عام پر آئی، غالباً راشدؔ کے پہلے مجموعہ ماورا پر نفسیاتی نقطہ نظر سے تنقید تھی جس میں راشدؔ کو ایک جنس زدہ شاعر ثابت کیا جس پر راشدؔ کو شکوک وشبہات تھے۔ انھی دنوں میں راشدؔ کی نظموں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔

یہ ترجمہ وکٹر کیرنز نے کیا یہ راشدؔ کو پسند آیا، قارئین کرام! ن م۔ راشد کے کلام کے چار مجموعے ماورا (1942) ایران میں اجنبی (1955) لا= انسان (1959) اور گمان کا ممکن (1977) شایع ہوئے شاعری کو سمجھنے کے لیے تخلیق کار مزاج سے آشنائی ضروری ہے کیونکہ موضوعات، ہیئت اور اسلوب کے انتخابات میں شاعر کا بنیادی مزاج کارفرما ہوتا ہے، راشدؔ کی شاعری کی تفہیم کے لیے بھی اس کی شخصیت اور عہد سے متشکل ہونے والے ان کے تخلیقی ذہن کو جاننا ضروری ہے، راشدؔ بلاشبہ اپنے عہد کے بڑے شاعر ہیں اور بڑا شاعر شعر کے بنے بنائے سانچوں سے مطمئن نہیں ہوتا، میرؔ کے عہد کے سانچے ابہام گو شعرا نے بنائے تھے میرؔ نے انھیں توڑا اور نئے سانچے بنائے غالبؔ نے صرف نیا اسلوب ہی وضع نہیں کیا بلکہ بعض روایتی تصورات کو بھی منکشف کیا۔ اقبالؔ نے روایتی زبان کو یکسر بدل دیا اور ایک بالکل نئی زبان میں نئی باتیں کیں، راشدؔ جس عہد میں شعور کی منزل پر پہنچے وہ برصغیر میں انگریزی حکومت کا دور آخر تھا۔ راشدؔ کے عہد کے شعرا کی شاعری پر رومانیت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ، اخترؔ شیرانی، میراجی، فیضؔ، جوشؔ جس شاعر کے پہلے مجموعے کو دیکھیں تو رومانیت نظر آئے گی۔ گناہ اور محبت میں پہلی بار راشدؔ کے ہاں محبت کے جسمانی پہلو کا تذکرہ ملتا ہے، اگرچہ اس نظم میں انھوں نے جسمانی ضروریات کو گناہ قرار دیا ہے۔

گناہ کے تند و تیز شعلوں سے روح میری بُھنک رہی تھی
ہوس کی سنسان وادیوں میں مری جوانی بھٹک رہی تھی
مری جوانی کے دن گزرتے تھے وحشت آلودہ عشرتوں میں

راشدؔ کے یہاں ایک پہلو ایسا بھی ہے جو اخترؔ شیرانی کی رومانیت سے علیحدہ کرتا ہے اور وہ رخصت یا اس پار جانے کی خواہش ہے،

مجھے اس خواب کی بستی سے کیا آواز آتی ہے
مجھے اس پار لینے کے لیے وہ کون آیا ہے
خدا جانے وہ اپنے ساتھ کیا پیغام لایا ہے

راشد کی ابتدائی نظموں میں اور تخیلاتی محبوبہ کے ساتھ اور تخیلات عشق کی کہانیاں ہیں لیکن یہ خیالی عشق عاشق کو زیادہ دیر اپنے قریب نہیں رکھ سکا۔

میراجی چاہتا ہے ایک دن اس خواب سے میں
حجاب فن و رقص و نغمہ سے آزاد کر ڈالوں
ابھی تک یہ گریزاں ہے محبت کی نگاہوں سے
اسے ایک پیکر انسان میں آباد کر ڈالوں

راشد کو ایک جنس زدہ شاعر ثابت کرنے کے لیے سب سے زیادہ ان کی دو نظموں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ایک ’’رقص‘‘ اور دوسری ’’انتظام‘‘ لیکن راشد کی شہرہ آفاق نظم کے ساتھ ہم اب آپ سے اجازت چاہتے ہیں کچھ مجبوریوں کو مجھے بھی دیکھنا ہے۔

حسن کوزہ گر

جہاں زاد پہنچے گلی میں ترے در کے آگے
یہ میں سوختہ سر کوزہ گر ہوں
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف
کی دکان پر میں نے دیکھا
تو تیری نگاہوں میں وہ تاب ناکی
تھی جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں

آج ہم جس کربناکی کے دور میں زندگی گزار رہے ہیں راشدؔ کی بھی یہی خواہش تھی کہ حضرت انسان ان ساری برائیوں سے دور ہو جائیں اور آیندہ نسلوں کو اس حبس زدہ ماحول سے ازخود کھلنا ہوگا۔

تری چھاتیوں کی جوئے شیر کیوں زہر کا اک سمندر نہ بن جائے
جسے پی کے سو جائے ننھی سی یہ جان

❁❁❁